www.iqbalkalmati.blogspot.com
گدھے کی واپسی
کرشن چندر

گدھے کی واپسی

کرشن چندر کی دیگر تصنیفات

باون پتّے
ایک گدھے کی سرگزشت
ہم وحشی ہیں
مٹی کے صنم
فلمی قاعدہ
کرشن چندر کے مزاحیہ افسانے
وزیروں کا کلب
یوکلپٹس کی ڈالی
مینا بازار
کسان اور مزدور
چمبل کی چنبیلی

کرشن چندر

مکتبہ شعر و ادب ○ سمن آباد ○ لاہور
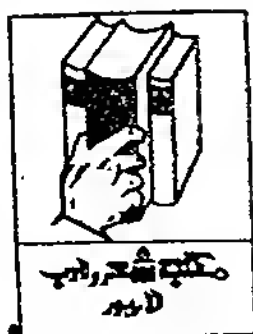
ناظرین باتمکین میں نہ روسیوں کا راکٹ ہوں۔ نہ امریکیوں کا پاکٹ ہوں۔ نہ گلی جبش خاں کا پھاٹک ہوں۔ نہ میں رمتا جوگی نیارا ہوں۔ نہ کوئی مصنوعی سیّارہ ہوں۔ نہ کسی فلم ہیروئن کا پیارا ہوں۔ نہ کسی لکھ پتی کی آنکھ کا تارا ہوں۔ میں محض ایک گدھا آوارہ ہوں۔ جسے بچپن کی غلط کاریوں کے باعث اخبار بینی کی عادت پڑ گئی تھی۔ جو نہ کویراج گرنام داس کے ہدایت نامہ سے دور ہوئی، نہ پیاری بہن جی کے علاج سے گئی اخبار پڑھتے پڑھتے میں انسانوں کی بولی بولنے لگا۔ اور اسرار حکمت و

سیاست کھولنے لگا۔ اسی کارن میں نے اپنا پیارا وطن بارہ بنکی چھوڑا اور ڈنکی بن کر دِتی کے ایک دھوبی سے ناطہ جوڑا۔ دھوبی کو اچانک ایک مگرمچھ نے کھا لیا۔ اور مجھے دھوبی کی بیوہ اور اُس کے یتیم بچّوں کے گذارے کے لیے حکام بالا کے حضور میں عرضی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عرضی لے کر میں دفتر دفتر گھوما اور منسٹر منسٹر پہنچا۔ اور پہنچتے پہنچتے ایک دن سیدھا پنڈت نہرو کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

پنڈت نہرو سے اتفاقیہ طور پر میرا جو انٹرویو ہو گیا۔ اُس نے مجھے آسمان شہرت کے بام پر پہنچا دیا۔ لوگ مجھے گھروں اور کلبوں میں بلانے لگے۔ گلیوں اور بازاروں میں میرا جلوس نکالنے لگے۔ ایک سیٹھ نے سمجھا میں کوئی خدائی فوجدار ہوں۔ یا کوئی کروڑپتی ٹھیکے دار ہوں۔ جس نے اوپر سے ایک معصوم گدھے کا بھیس دھارا ہے۔ اور اندر ہی اندر کوئی بہت بڑا ٹھیکہ مارا ہے۔ وہ بعد منت و سماجت مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اپنی فرم کا حصے دار بنانے لگا۔ اپنی حسین لڑکی سے میری شادی رچانے لگا۔ اور ہائی سوسائٹی میں مجھے گھمانے لگا۔ میں نے بہت انکار کیا۔ اصرار کیا۔ بتایا میں یوں تو علم و دانش سے لدا ہوں۔ مگر دراصل ایک گدھا ہوں۔ مگر وہ لالچ کا اندھا میری بات پوری سننے سے پہلے ان سنی کر دیتا تھا۔

اور اپنی ہی ہانکے جاتا تھا۔ اور برابر میری تحاظر کئے جاتا تھا۔

چند ماہ تو بڑے عیش و آرام میں گئے۔ مگر جس دن اُس لالچی سیٹھ کو پتہ چلا کہ میرے پاس کوئی پرمٹ ہے نہ کوٹہ۔ اُسی دن وہ بے پیندے کا لوٹا مجھے مارنے پر تُل گیا۔ اور کمرہ بند کر کے اُس نے اور اُس کی لڑکی نے مار مار کر میرا بھُرکس نکال دیا۔ اور مجھے سخت زخمی کر کے باہر سڑک پر ڈال دیا۔

چھ ماہ تک میں جانوروں کے ہسپتال میں پڑا زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ درد کی شدت سے کراہتا رہا۔ انسانوں کی بے حسی اور گدھوں کی بے بسی پہ رو تا رہا۔ مگر قدرت کو میرا جینا منظور تھا۔ اور میرے لیے زندگی کا زہر پینا مقدور تھا۔ اس لیے میں اچھا ہو گیا۔

صحت یاب ہوتے ہی ہسپتال کے نیک دل ڈاکٹر نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ اور میری بیٹھ پہ دو سیر گھاس لاد کر کہا۔ تمہارے لیے یہ دو سیر گھاس کافی ہے۔ باقی اللہ شافی ہے۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اور میرا دماغ کھانے نہ آؤ۔

میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب میں ایک پڑھا لکھا گدھا ناکارہ ہوں اس لیے مفلس اور آوارہ ہوں۔ میں جب تک جیوں گا تمہارے جان و مال

<

کو دعائیں دوں گا مگر اس بل کو ادا نہیں کر سکتا!

ڈاکٹر کہ جس کا نام رام اوتار تھا۔ اور جو اپنے کام میں بڑا ہوشیار تھا میری مجبوری سمجھ کر مسکرا دیا۔ اور بل کو واپس اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔ تو میرا یہ قرض تم پر باقی رہا۔ اب اگر واقعی تم یہ قرض ادا کرنا چاہتے ہو تو سیدھے بمبئی چلے جاؤ!

بمبئی۔ میں نے پوچھا۔

ہاں۔ ڈاکٹر بولا۔ مغربی ہندوستان میں ایک شہر آباد ہے۔ جو سب شہروں کا استاد ہے۔ جس کا نام بمبئی ہے۔ تم سیدھے وہاں چلے جاؤ۔ اور کام کر کے میرا قرض چکاؤ۔

میں خود دہلی میں نہ رہنا چاہتا تھا۔ دہلی جس نے میری شہرت کا عروج دیکھا تھا اور جو اب میری ذلت کی پستیاں دیکھ رہی تھی اب مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس لیے میں نے ڈاکٹر کی صلاح مان لی۔ اور بمبئی جانے کی ٹھان لی۔

دہلی سے میں ریل پٹڑی کے کنارے کنارے ہو لیا۔ اور متھرا پہنچا۔ کیونکہ مجھے متھرا کے پیڑے کھانے کا بہت شوق تھا۔ مگر متھرا میں مجھے پیڑوں کی بجائے پانڈوں کے ڈنڈے کھانے کو ملے۔ اور میں وہاں سے

جان بچا کر سیدھا گوالیار پہنچ گیا۔ مقصد یہ تھا کہ تان سین کے مزار پہ جاؤں اور اس عظیم موسیقار کے سامنے اپنا سیس نواؤں۔ کہ جس کے نام سے ہندوستان میں کلاسیکل موسیقی کا بھرم قائم ہے۔ اور یہ تو سب لوگ جانتے ہیں کہ آج کل ہندوستان میں صرف دو طرح کے لوگ کلاسیکل موسیقی پسند کرتے ہیں۔ ایک تان سین کے معتقد... دوسرے گدھے اور نہ ساری دُنیا ریڈیو سیلون سنتی ہے!

تان سین کے مزار پہ بڑا سناٹا تھا۔ ایک کونے میں دو مجاور پڑے اونگھ رہے تھے۔ فرش پر باسی ہاروں کی پتیاں بکھری پڑی تھیں۔ ذرا فاصلے پر چند بھیڑ بکریاں فلمی سپلے بیک گانے والیوں کی طرح ممیا رہی تھیں۔ آفتاب موسیقی کے مزار کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کو بہت دُکھ ہوا اور میں نے وہیں چار زانو ہو کر مرحوم اُستاد کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کیا۔ اور پھر سر اُٹھا کر شدھ جھنجھوٹی میں ایک ایسی زوردار تان لگائی جس نے جھنجھوڑ کر خوابِ خرگوش میں سوئے ہوئے مجاوروں کو جگا دیا۔ وہ جاگ کر میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ اور بجائے اس کے کہ لوگ میرے ذوقِ سلیم بلکہ ذوقِ اکبر کی داد دیتے جس کے سہارے میں نے اُستاد مرحوم کی رُوح کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لوگ ہتھے چپا ٹر کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ اور مجھے ڈنڈے

مار مار کر انھوں نے وہاں سے بھی بھگا دیا۔

میں ڈنڈے کھا کر اس قدر بے مزہ نہ ہوا تھا جتنا یہ سوچ کر بے مزہ ہوا کہ اب اس ملک میں آرٹ اور کلچر کا خدا ہی حافظ ہے۔ جہاں ایک پکے گانے والا دوسرے پکے گانے والے کو خراج عقیدت بھی ادا نہیں کر سکتا! لہذا میں نے زور کی دولتی جھاڑی اور راستے میں خلیج دیکھی نہ کھاڑی سیدھا بمبئی آ کے دم لیا۔ یہاں پر گھیسو گھسیارے نے مجھ پر کرم کیا۔ اور مجھے تھان پر باندھ لیا۔ گھیسو گھسیارا۔ تھا بڑا بے چارہ، کیونکہ اس کے تھے بچے گیارہ! وہ گھاس کا ایک گٹھا اپنے سر پر لادتا تھا۔ اور چار میری پیٹھ پر۔ اور روز پہنچ جاتا تھا جوگیشوری میں دودھ بیچنے والے گوالوں کے پاس۔ جو اس کی گھاس کے گٹھے خرید لیتے تھے۔ اور اسے اس کی رقم دے دیتے تھے۔ پیسے لے کر وہ سیدھا جوزف ڈی سوزا کی جھونپڑی میں جاتا تھا۔ اور جاتے ہی ایک لوٹا ٹھرے کا چڑھاتا تھا۔ اور لپتہ دوست رمضانی قصائی اور کرنیل سنگھ ٹیکسی ڈرائیور سے گپ لڑاتا تھا۔

میں جھونپڑے کے باہر ناریل کے پیڑوں کے نیچے ہری ہری گھاس چرتا تھا۔ اور شکر کرتا تھا کہ آخر مجھے عافیت کی زندگی ملی۔

بمبئی میں آ کر میں نے انسانوں کی بولی ترک کر دی تھی کیونکہ تجربے نے

مجھ پر ثابت کر دیا تھا۔ کہ انسانوں کی دُنیا میں وہی لوگ خوش رہ سکتے ہیں
جو گدھے بن کر رہیں۔ عقل مند کا یہاں گزارہ نہیں کیونکہ نیک مشورہ کسی کو
پیارا نہیں! اس لیے میں انسانوں کی بولی سے حذر کرنے لگا۔ اور ایک
جانور کی زندگی بسر کرنے لگا۔ جیسے بمبئی میں وہ سب لوگ بسر کرتے ہیں کہ
جن کے لیے پیسہ ہی محبوب ہے۔ اور جنھیں صرف اپنا عیش و آرام مرغوب
ہے!

چھ ماہ کے عرصے میں میں ہری ہری گھاس کھا کر خوب موٹا ہو گیا۔ میری
کالی کھال چکنی ہو گئی اور میری ایال پر صحت کا رنگ چمکنے لگا۔ اور میں ایک
خوب صورت گدھا بن گیا جس پر کوئی بھی گدھی عاشق ہو سکتی تھی۔ اور یہ تو
صنفِ نازک کی کمزوری ہے۔ کہ وہ ہمیشہ خوب صورت گدھوں پر عاشق
ہوتی ہے۔ چکنی کھال پر اُس کی جان جاتی ہے۔ چاہے اُس کے اندر بھُس
ہی بھرا ہو۔

اِدھر کچھ عرصے سے دو تین گدھیوں نے مجھ پر ڈورے ڈالنے شروع کئے
تھے۔ مگر اِن میں سے جو سب سے زیادہ نرم و نازک شیریں اداؤں والی تھی وہ
مجھ سے مطلق التفات نہ کرتی تھی۔ اِس لیے میرا دل بار بار اُس کی جانب کھنچا
چلا جاتا تھا۔ اور ایک عجیب و غریب کشش میرے دل میں اُس کے لیے محسوس

ہوتی تھی۔ اُس کے کان لانبے پتلے مخروطی اور سنہرے بالوں والے تھے اور جس طرح وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بے حد دانتوں سے ہری دوب چگتی تھی۔ اُس پر میرا دل لوٹ لوٹ جاتا تھا۔ وہ دوسری بھو کی چیڑی گدھیوں کی طرح گھاس پر پل نہیں پڑتی تھی۔ بلکہ جس نخوت سے اور ایک لقمہ کھا کر الگ ہو جاتی تھی اور بڑی گھاس کو سونگھ کر بیزاری سے چھوڑ دیتی تھی۔ اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نہایت اعلیٰ اور امیر و کبیر خاندان کی گدھی ہے۔ جو محض تفریح کی خاطر گدھوں کے اس غول میں جوزف ڈی سوزا کی جھونپڑی کے باہر ناریل کے پیڑوں کے نیچے چرنے کے لیے چلی آتی ہے۔ بھوک امیروں کے لیے ایک عمدہ تفریح ہے۔ غریبوں کے لیے ایک شدید ضرورت ہے۔

ایک روز موقع پا کر میں اُس کے قریب چلا گیا۔ وہ ناریل کے ایک جھنڈ کے نیچے اکیلی گھاس چر رہی تھی۔ اور عجب شان بے اعتنائی سے اپنی دم ہلا رہی تھی۔ کہ میں نے اُس کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

"اے پری جمال، خوش خصال۔ کب تک ہم سے نظریں چراؤ گی؟ ذرا ادھر تو دیکھو اپنے عاشق کی طرف!"

ہشت! وہ اپنے نتھنے پھلا کر بڑی نخوت سے ہنہنائی۔

آخر ایسی بھی کیا بیزاری؟ میں بھی ایک گدھا ہوں! میں نے کہا۔

"عشق میں ہر شخص گدھا ہو جاتا ہے!" اُس نے ایسے کٹیلے لہجے میں مجھ سے کہا کہ میں ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا۔ واقعی بے حد حاضر جواب گدھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا نہایت اعلیٰ تربیت پائی ہے۔ میں نے سوچا اگر اس سے میری شادی ہو جائے تو زندگی سنور جائے۔ ورنہ عام گدھوں کی ایسی گدھیوں سے شادی ہوتی ہے جنھیں گھاس چرنے اور بچے جننے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا مگر یہ تو بڑی عاقل و فرزانہ معلوم ہوتی ہے۔ قدرت نے اسے حسن کے علاوہ اعلیٰ ذوق بھی عطا کیا ہے۔ ارے اس کے ساتھ تو عمر بھی دیکھی جا سکتی ہے ذرا سوچو تو ہمارے بچے کتنے ذہین ہوں گے۔ بالکل گدھے تو نہ ہوں گے۔

میں نے اُس کی طرف گردن بڑھا کر کہا۔ "ڈارلنگ!"

اُس نے ایسی زور کی دولتی جھاڑی کہ اگر میں فوراً ہی اپنی گردن نہ موڑ لیتا۔ تو شاید میری آنکھ ہی پھوٹ جاتی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کے نتھنوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ شعلہ بار نگاہوں سے مجھے تاکتی ہوئی بولی۔

"ایک گھسیارے کے گدھے ہو کر مجھ سے عشق کرتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "تم کون ہو؟"

وہ بولی ۔ میں وکٹر برگانزر کی گدھی ہوں، جو جوزف ڈی سوزا کا باس ہے ۔ اور دس بھٹیوں کا مالک ہے ۔ گررے گاؤں سے داور تک اس کا ٹھرا بکتا ہے ۔ اور میں تمھاری طرح گھاس نہیں لادتی ہوں۔ شراب کے صرف چار پیپے گررے گاؤں سے لاد کر یہاں جوگیشوری میں جوزف ڈی سوزا کے جھونپڑے تک پہنچا دیتی ہوں۔ پھر شام کو خالی پیپے واپس لے کر جاتی ہوں۔ تمھاری طرح دن بھر گدھوں کی طرح محنت نہیں کرتی ہوں ۔

کیا بات ہے بیٹی ؟ یکایک قریب سے ایک آواز آئی۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک پختہ عمر کی مگر اجلی قسم کی گدھی نوجوان گدھی کے قریب آگئی ہے ۔

"کچھ نہیں اماں"! نوجوان گدھی نے کہا "یہ گدھا مجھ سے عشق کرنے چلا ہے! ذرا سنو تو اس کی بات!!

پختہ عمر کی گدھی نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا ۔ اور بولی "تم کون ہو؟"

میں نے بتایا ۔

سن کر بولی "یہ تمھارا ہمارا کیا میل ؟ تم ہندو ہم عیسائی ۔! کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"یو۔پی کا!"

"لو۔ تم یو۔پی کے ہم تمہارا انتظار کرکے۔ تمہارا ہمارا کیا جوڑ؟"

"کون جات ہو؟"

"گدھوں کی بھی جات ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

واہ کیوں نہیں ہوتی؟ جو مالک کی جات ہوتی ہے وہی اس کے غلام کی جات ہوتی ہے۔ وہی اس کا دھرم ہوتا ہے۔ ہم جانور لوگ تو اپنے مالک کے رتبے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہم وہی سوچتے اور کرتے ہیں جو انسان کرتا ہے۔

"حالانکہ میں نے تو اکثر انسانوں کو جانوروں کی طرح سوچتے اور کرتے دیکھا ہے! بڑی کا بی!" میں نے عاجزی سے کہا۔

بڑی بی کو میری بات پسند آئی۔ بولی۔ تم سمجھدار گدھے معلوم ہوتے ہو اچھا یہ بتاؤ۔ اگر میں اپنی بچی کی شادی تم سے کرنے پر تیار ہو جاؤں تو تم میری بچی کو کہاں رکھوگے؟ اور کیا کھلاؤگے؟

رکھنے کو کوئی خاص جگہ تو نہیں ہے گھیسو گھسیارے کے ہاں۔ وہ مجھے رات کو گھر کے باہر جامن کے پیڑ سے باندھ دیتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات مجھے کھلا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ میں ادھر ادھر گھاس چر کر اپنا پیٹ بھر لوں۔

"تو وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالتا ہے کیا؟"

"نہیں؟"

"تو اس کا مطلب ہے کہ میری بچی کی اگر تمہارے سنگ شادی ہو جائے تو اُسے بھی گھاس نہیں ملے گی؟"

عشق میں گھاس کا کیا گذر؟ اقبال نے کہا ہے۔ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق!

عشق بڑی بی! عشق تو عشق ہے اور گھاس گھاس ہے! ___ مجھے دیکھو۔ عشق بھی کرتا ہوں اور گھاس بھی کھاتا ہوں۔ اور کبھی کبھی جب گھاس نہیں ملتی تو صرف عشق کھاتا ہوں! قوالی گاتا ہوں۔ یہ عشق عشق ہے عشق عشق! بڑی بی تم میری مانو۔ اپنی بیٹی کو میرے حوالے کر دو۔ گھاس کا کیا ہے۔ یہ دنیا بڑی وسیع ہے۔ کہیں نہ کہیں گھاس مل ہی جائیگی۔

"جی نہیں! بڑی بی بڑی سختی سے بولیں میں اپنی معصوم بچی کی تم سے ہرگز ہرگز شادی نہ کروں گی جس کے نہ باپ کا پتہ نہ ماں کا۔ نہ دھرم ٹھیک نہ جات درست۔ جس کا کوئی گھر ٹھکانہ نہیں۔ رہنے کے لیے کوئی تھان نہیں۔ کھانے کے لیے گھاس نہیں، اُوپر سے پڑھے لکھے آدمی کی طرح بات کرتے ہو!"

میں نے فخریہ لہجے میں کہا "میں اخبار پڑھ سکتا ہوں! مگر اس میں کیا

بُرائی ہے ؟"

"یہ تو بہت بُری بات ہے ! بڑی بی جل کر بولیں۔ آجکل ہندوستان میں جتنے پڑھے لکھے گدھے ہیں سب کلرکی کرتے ہیں۔ یا فاقہ کرتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ۔ تم نے آج تک کسی پڑھے لکھے معقول آدمی کو لکھ پتی ہوتے دیکھا ہے ؟ نہ بھیّا۔ میں تو اپنی بیٹی کی کسی لکھ پتی سے شادی کروں گی چاہے وہ بالکل ان پڑھ گھامڑ گدھا ہی کیوں نہ ہو ؟

مجھے اس گدھی کی احمقانہ باتوں پر بڑا غصّہ آیا مگر چونکہ معاملہ عشق کا تھا اس لیے میں نے زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے اسے پھر سے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"دیکھو اماں آجکل کا نیا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں دھرم جات پات کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہم سب ہندوستانی ہیں ہم سب گدھے ہیں۔ بس اتنا ہی سوچ لینا کافی ہے۔ یہ سوال قومی وحدت کا ہے "

امیر اور غریب میں قومی وحدت کیسی ؟ تمہارے مسائل الگ ہمارے مسائل الگ۔ تمہارے مفاد الگ ہمارے مفاد الگ۔ تمہارا معیار زندگی الگ۔ ہمارا معیارِ زندگی الگ۔ اور پھر ہم تو ہندوستانی بھی نہیں۔ ہماری تو نسل بھی تم سے الگ ہے۔ میری بچی کا دادا خدا انھیں کروٹ کروٹ

جنّت نصیب کرے۔ خالص انگریزی گدھے تھے۔ اور میری ماں فرانسیسی نسل کی تھیں۔ اور تم ٹھہرے ایک آوارہ۔ بے کار۔ کالے ہندوستانی گدھے۔ اور چلے ہو میری بیٹی سے عشق جتانے؟ خبردار جو میری بیٹی کی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی دیکھا! دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گی۔

یہ کہہ کر بڑی بی نے میری طرف پیٹھ کر کے اتنے زور کی دولتی جھاڑی کہ میں گھبرا کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور سیدھے ڈی سوزا کی جھونپڑی کے سامنے آ کے دم لیا۔ اور اُس دن سے عہد کر لیا کہ اب کبھی عشق نہیں کروں گا۔ کیونکہ عشق کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ کہ آدمی شاعرانہ طبیعت رکھتا ہو۔ عشق کرنے کے لیے یہ بھی اشد ضروری ہے کہ آدمی کو دو وقت کی گھاس میسّر ہو! ـــــ ورنہ کوئی عورت گھاس نہیں ڈالے گی!

اس لیے میں نے اُس پیری بیکر گدھی سے عشق کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اپنی زندگی کو صرف گھاس لادنے کے لیے وقف کر دیا کہ جو ہر گدھے کا مقدّر ہے!

"کھل جانا آرے کالونی کا لیبٹی جن!"

"اور بھوک کے مرنا جو گیشوری کے گوالوں کا"

گیسو گھسیارے کا بیچ دینا اپنے گدھے کو۔

"اور بیان نئی مصیبتوں کا....."

دن بڑے آرام سے گزر رہے تھے۔ گھاس لادنا گھاس کھانا۔ اور اپنے کھونٹے پہ جا کے سو جانا۔ زندگی اس سے سادہ اور کیا ہو سکتی ہے اور اس دنیا میں بیشتر لوگ اس سے زیادہ اور چاہتے بھی کیا ہیں؟ مگر اس فلک کج رفتا کو کیا کہیئے۔ کہ میرے چند دنوں کا یہ سکون بھی اسے گوارا نہ ہوا۔

اوّل اُفتاد یہ پڑی کہ گورنمنٹ نے رفاہ عام کی خاطر بمبئی میں خالص دودھ سپلائی کرنے کے لیے ایک بہت بڑی ڈیری آرے کالونی کے

نام سے چالو کر دی۔ تمام مصیبتیں اسی طرح نیک ارادوں سے شروع ہوتی
ہیں۔ اب بھلا بمبئی میں خالص دودھ کی کیسے ضرورت تھی؟ بمبئی کے بہادر
باشندوں نے جنگ آزادی کی ساری لڑائی ایرانیوں کی چائے اور گوالوں
کا آدھا دودھ اور آدھا پانی پی کر لڑی۔ جیتی۔ اور زندہ رہے۔ انھیں
خالص دودھ مہیا کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اُن
کے ذہن خواہ مخواہ مزید جد وجہد اور لڑائی کے لیے گرما دیا جائے غالباً
سرکار کا مقصد یہ نہ رہا ہوگا۔ مگر ہوتا یہی ہے۔ ایک اہم ضرورت کو
پورا کر دینے سے دوسری ضرورتوں کی بھوک بڑھ جاتی ہے۔ اور جاننے
والے یہ جانتے ہیں کہ جس دن سے بمبئی آرے کالونی کی بنیاد پڑی
اُس دن سے ملکیت مہاراشٹر کا قصّہ بھی شروع ہو گیا۔ آخر آپ لوگوں کو
خالص دودھ پلا کر ان سے اور کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟ یہ ایرانیوں کی چائے
ہی تھی جو مہاراشٹر اور گجرات میں تال میل پیدا کئے ہوئے تھی۔ ورنہ دودھ
تو ہمیشہ تقسیم کرتا ہے۔ اصل پنجاب کہیں سے بیٹھے۔ دودھ پینے کے عادی
تھے۔ اسی لیے تقسیم ہو گئے۔ قصور دودھ کا تھا اور الزام دھرا جاتا ہے
بے چارے انگریزوں پر۔ حالانکہ صاحب! دودھ میں ایسی قوت ہے کہ اگر
آپ کچھ نہ کریں۔ اسے چند گھنٹوں کے لیے کسی برتن میں اکیلا چھوڑ دیں۔

خود بخود تقسیم ہو جائے گا۔ دودھ کا دودھ الگ۔ پانی کا پانی الگ۔ انسانی تاریخ میں اس طرح کی بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے دُور رس نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر سوچئے کہ اگر محمد بن قاسم نے ہندوستان کے بجائے چین پر حملہ کیا ہوتا تو آج پاکستان چین میں ہوتا۔ اگر نپولین پانی پت میں پیدا ہوا ہوتا تو واٹرلو کی لڑائی میں انگریزوں کی کبھی جیت نہ ہوتی۔ اگر کولمبس کی کشتی سمندر میں ڈوب جاتی تو امریکہ کبھی دریافت نہ ہوتا۔ اور بے چارہ کولمبس زبانِ حال سے غالب کا یہ مصرعہ دہراتا۔

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا"

اسی قسم کے استدلال سے ٹائن بی نے اپنی پوری تاریخ مرتب کی ہے۔ اسی لیے میں بھی کہتا ہوں۔ کہ اگر آرے کالونی نہ بنتی تو مہاراشٹر کا صوبہ بھی نہ بنتا۔ یہ صرف دودھ کا قصور ہے۔ دودھ جو تقسیم کرتا ہے!

بمبئی کے شریف لوگ قریباً ایک سو سال سے ایرانیوں کی پھیکی سیٹھی چائے پیتے چلے آ رہے تھے۔ اب اُنھیں جو خالص دودھ پینے کو ملا۔ تو اُن کا ہاضمہ اکدم بگڑ گیا۔ اور جب عوام کا ہاضمہ بگڑتا ہے تو وہ طرح طرح کی مانگ کرنے لگتے ہیں۔ ہمیں مہاراشٹر چاہیئے۔ ہمیں کام چاہیئے۔ ہمیں روٹی چاہیئے۔ ہمیں مکان چاہیئے۔ چھاتا چاہیئے۔ سینما چاہیئے۔ تعلیم چاہیئے

اور ہر شئے اتنی ہی سستی اور عمدہ چاہیئے جتنا کہ آرے کالونی کا دودھ ہے"!

اسی لیے پُرانے زمانے میں جو لوگ حکومت کرتے تھے وہ عوام کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتے تھے۔ اس سے عوام کا ہاضمہ بالکل درست رہتا تھا، مگر اب تو وہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ کسی خوشنما وعدے کے چورن سے ٹھیک نہیں ہو سکتا!

آرے کالونی کے بن جانے سے جہاں ایک طرف لوگوں کا ہاضمہ بگڑا وہاں دوسری طرف کچھ طور پر دودھ بیچنے والے گوالوں کی گاہکی بھی کم ہو گئی اور سینکڑوں گوالے بیکار ہو گئے۔ انھوں نے اپنی گاہکی کو قائم رکھنے کیلئے ہر ممکن کوشش کر ڈالی کبھی دودھ کا بھاؤ کم کیا، اور پانی زیادہ ملایا۔ کبھی گھاس کا بھاؤ کم کیا اور گھسیارے کو زیادہ دبایا۔ کبھی پانی کی تعداد کم کی اور نقصان زیادہ اٹھایا۔ مگر آرے کالونی کے سامنے اُن کی پیش نہ گئی۔ اور آرے کالونی کا دودھ زیادہ مقبول ہوتا گیا۔ اور پرائیویٹ تجارت کرنے والے گوالے اپنے اونچے منافع سے ہاتھ دھونے لگے۔ اگر وہ بالکل خالص دودھ بیچتے اور آرے کالونی سے ذرا کم دام پر بیچتے۔ تو اب بھی وہ تھوڑا سا منافع کما سکتے تھے۔ مگر یہ تو تجارت کے اصول کے

خلاف ہے۔ اور ہمارے نظامِ زندگی میں اُس وقت تک تجارت نہیں ہو سکتی جب تک کسی ایک چیز میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ کی جائے مثلاً دودھ میں پانی۔ ادب میں عریانی۔ آٹے میں برادہ۔ نفرت پر مذہب کا لبادہ۔ گھی میں تیل۔ حکومت میں رشوت کا میل۔ یہ تو تجارت کا پہلا اصول ہے۔

تجارت کا دوسرا اصول یہ ہے۔ کہ اس آمیزش میں بھی بلند و پست کا توازن برقرار رکھا جائے۔ مثال کے طور پر اگر آپ نے دودھ میں شہد ملا دیا تو تجارت ہو چکی۔ ایک اعلیٰ چیز کے ساتھ کسی دوسری اعلیٰ پائے کی چیز کو نہیں ملایا جا سکتا۔ تجارت کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ایک اعلےٰ معیار کی شے کے ساتھ ایک معمولی۔ کم حیثیت سستی شے کو (اگر نقصان دہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں) ملا دیا جائے۔ آج کل کی تجارت کا تمام کمال و فن اسی میں ہے۔ مثال کے طور پر پانی کی اپنی جگہ پہ کیا قیمت ہے ؟ میرے ایسے گدھے تک بھی اسے مفت ہی لیتے ہیں۔ لیکن یہی پانی جب دودھ میں ملتا ہے تو اپنے سے چوگنی قیمت پاتا ہے۔ لکڑی کے برادے کی اپنی جگہ کیا حیثیت ہے ؟ لیکن یہی برادہ جب آٹے میں ملتا ہے تو دسترخوان کی زینت بن جاتا ہے۔ نفرت اپنی جگہ کتنا

گھٹیا جذبہ ہے۔ لیکن جب مذہب کی سان پہ چڑھ جاتا ہے تو لاکھوں بے گناہوں کی جان لے لیتا ہے! تجارت کے اِسی گُر سے نہ صرف دودھ کے دکاندار بلکہ مذہب کے تاجدار اور سیاست کے ساہوکار بھی واقف ہیں!

جب گوالوں کا دودھ بکنا بند ہو گیا تو گھیسو گھسیارے کا گھاس بکنا بند ہو گیا۔ تو گھر میں گھیسو گھسیارے اور اُس کے بیوی بچّوں کو فاقے لگنا شروع ہوئے۔ صورتِ حال اس درجہ نازک ہو گئی کہ ایک روز جوزف ڈی سوزا کی جھونپڑی میں گھیسو گھسیارے نے مجھے نیچنے کی سوچ لی۔ یہ ترکیب اُسے رمضانی قصائی نے سمجھائی تھی۔ بات یوں چلی کہ گھیسو گھسیارا جب سے کار ہوا تھا۔ زیادہ پینے لگا تھا۔ اور اُدھار پینے لگا تھا۔ پہلے تو جوزف اُدھار پہ ٹھرّا پلاتا رہا۔ مگر جب اُدھار حد سے زیادہ بڑھ گیا اور گھیسو کی آمدنی کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ تو اُس نے بھی ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ بلاشبہ گھیسو کا دوست تھا۔ مگر ایک دوست بھی کہاں تک کسی کو مفت پلا سکتا ہے؟

اس موقعے پر رمضانی قصائی نے گھیسو کو مشورہ دیا۔ میں جھونپڑی کے باہر کھڑا سُن رہا تھا۔ کہنے لگا۔ اگر تم اس گدھے کو میرے ہاتھ بیچ دو تو میں تمھیں اس کے پچیس روپے دے دوں گا۔

جوزف بولا۔ ہاں ٹھیک تو کہتا ہے رمضانی ۔آج کل تمہاری گھاس کہیں نہیں بک رہی ہے ۔ اس لیے تم اس گدھے کو رکھ کر کیا کرو گے ؟ پھر سات روپے میرے بھی باقی ہیں تم پر۔ وہ بھی اسی رقم میں سے کٹ جائیں گے ۔

کرنیل سنگھ بولا۔ اور باقی رقم پر تم دس دن بلاناغہ مزے سے پی سکتے ہو۔ آگے دیکھا جائے گا!

میں دروازے کے قریب سرک آیا۔ اور انتہائی خاموشی سے اُن کی باتیں سُننے لگا۔

گھیسو بولا۔ اِس بے چارے گدھے کا کوئی خرچ تو ہے نہیں مجھ پر خود ہی دن میں اِدھر اُدھر ۔۔۔ گھاس چر کر میرے گھر کے باہر آکے پڑ رہتا ہے ۔ دن بھر میرے بچے اس کی سواری کرتے ہیں ۔ اور ایک آدھ گھاس کا گٹھا تو اب بھی بک ہی جاتا ہے ۔

رمضانی بولا۔ وہ ایک آدھ گھاس کا گٹھا تم خود اپنے سر پر لاد کے بیچ سکتے ہو۔ تم خود سوچ لو پورے پچیس روپے دوں گا۔ اور وہ بھی دستی میں دے رہا ہوں ۔ ورنہ یہ گدھا تو بند رہ روپے میں بھی مہنگا ہے ۔

گھیسو بولا ۔ تم اس گدھے کو لے کر کیا کرو گے ؟

رمضانی اِک آہ بھر کر بولا۔ اِس دُنیا میں جینا بہت مشکل ہو چلا ہے
آج کل بھیڑ بکریاں ایسی دبلی پتلی آ رہی ہیں۔ کہ ایک بکری کے اندر سے
تین سیر گوشت بھی مشکل سے نکلتا ہے۔ اب یہ تمہارا گدھا تو ماشاءاللہ کتنا
اور موٹا تازہ ہو رہا ہے۔ اس کا گوشت نہایت ہی عمدہ نکلے گا!
تو تم گدھے کا گوشت بیچو گے؟ گھیسو نے حیرت سے پوچھا۔
ہاں! مگر بکری کے گوشت میں ملا کے بیچوں گا" رمضانی بولا۔
بکری کے گوشت میں ملا کے بیچو گے؟ گھیسو حیرت سے چلایا۔
اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ رمضانی نے ذرا خفا ہوتے ہوئے کہا۔
تمہارے گوالے کیا دودھ میں پانی ڈال کے نہیں بیچتے ہیں؟
مگر گدھے کا گوشت؟ گھیسو نے پھر آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ لوگوں کو یہ
نہیں چلے گا۔
یہ تو اپنے اپنے پیشے کے گُر کی بات ہے! رمضانی بولا۔ میں نے تو ایسے
ایسے اُستاد دیکھے ہیں جو بکری کے گوشت میں کتے کا گوشت ملا کر بیچ دیتے
ہیں۔ میں تو صرف گدھے کا گوشت بیچوں گا۔ اور پھر قیمے میں تو کچھ پتہ ہی
نہیں چلتا ہے!
یہ تو اپنے اپنے پیشے کی بات ہے! کرتل سنگھ ڈرائیور رمضانی کی

ران پر تھپکی مار کر بولا۔ ورنہ ہم لوگ پٹڑوں میں کیا کیا گھپلا کر جاتے ہیں! اور نہ کریں، تو زندہ کیسے رہیں؟ اس لیے میرے یار! کرتیل سنگھ نے گھیسو کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اب تم دیر نہ کرو!

میری ٹانگیں خوف سے سن ہو گئی تھیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے میری ہر ٹانگ کے ساتھ چار چار من کے پتھر باندھ دیئے ہوں۔ میں چھپر کی دیوار کے ساتھ دروازے کے پیچھے لگا یہ گفتگو سن رہا تھا۔ جس میں میری زندگی اور موت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ میں یہ سننا چاہتا تھا کہ آخر گھیسو کیا کہتا ہے۔ ایک بے زبان جانور نے اتنے ماہ اُس کے لیے دل و جان سے محنت کی تھی۔ اور معاوضے میں گھاس کا ایک تنکا نہ لیا تھا۔ کیا اُس کے لیے انسان کے سینے میں شکر کا ایک رتی بھر جذبہ نہ ہوگا۔

گھیسو نے کہا، یہ گدھا مجھ سے اور میرے بچوں سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ اس کی جان لینے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ تھوڑی سی اور دو یار۔ لو پیئو۔ رمضانی نے اُس کا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ مگر تم اُس کی جان کہاں لے رہے ہو۔ جان لینے والا یا رکھنے والا وہ اوپر والا ہے۔ رمضانی نے کھپریل کی چھت کی طرف ایک انگلی اُٹھا کر کہا۔ تم تو گدھے کو خالی میرے ہاتھ پچیس روپے میں فروخت کر رہے ہو۔ اور یہ پچیس بھی میں دے رہا ہوں

یا کسی یاری کے لیے ۔ کسی دوسرے سے بات کرو گے تو دس بھی نہ دے گا۔
رہنے دو۔ نہیں تمہارا جی چاہتا ہے تو نہ سہی !
کرنیل سنگھ نے بات پلٹ کر کہا۔ ابے کل تو کہاں گیا تھا رمضانی
یہاں نہیں آیا۔
بھیّا ! میں عقیلہ بانو گڑھوالی کی قوالی سننے گیا تھا۔ ظالم کیا گاتی ہے
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ہم کو ناز تھا وہ دل نہیں رہا
رمضانی پہلے گنگناتا رہا پھر زور زور سے گانے لگا گھیسو زور زور سے
سر ہلانے لگا۔ اور کرنیل سنگھ ٹین کا ایک خالی ڈبہ بجانے لگا۔ میں نے
اطمینان کا سانس لیا چلو زندگی بچ گئی۔ آئی ہوئی موت ٹل گئی۔ گھیسو گھسیارہ سرور
میں آکر بولا۔ یہ کلیں کیا اگر کوئی پچاس ہزار بھی دے تو بھی اپنا گدھا نہ
بیچوں۔
یار کون تیرے گدھے کی بات کرتا ہے ؟ جوزف ذرا غصے سے بولا۔ رمضانی
کا گانا تو سننے دے !
مگر گھیسو گھسیارے کو چڑھ ہو گئی تھی۔ وہ زور سے اپنا ہاتھ جھلاتے ہوئے
بولا۔ کوئی پچیس لاکھ بھی دے تو میں اپنا گدھا نہ دوں۔ اس گدھے نے اتنی

میری خدمت کی ہے۔ میری اور میرے بچّوں کی۔ کہ میں زندگی بھر اسے اپنے پاس رکھوں گا۔ جب بیارے کبھی کبھی مجھے دیکھتا ہے اس سے مجھے معلوم ہوتا ہے جیسے اس گدھے کی کھال کے نیچے کسی نیک سادھو کی آتما چھپی ہوئی ہے۔ کوئی پچیس کروڑ بھی دے تو میں یہ گدھا نہ دوں۔ گھیسو گھسیارے نے آج تک کسی کی جان نہیں لی۔ یہ ہمارے دھرم شاستر کے خلاف ہے!

لے آیا پھر یہ بیچ میں اپنا دھرم! کرنیل سنگھ ڈرائیور چڑھ کر بولا۔ یار جوزف جلدی سے اس کا گلاس بھر دو!

کہاں سے بھر دوں؟ جوزف غصّے سے بولا۔ سات روپے کی یہ پہلے ہی پی چکا ہے۔ کہاں تک اُدھار دوں گا؟

بھر دو! بھر دو! گھیسو زور سے چلایا۔ وہ بھگوان دینے والا ہے کہیں نہ کہیں سے تمھارا قرض بھی اُتار دے گا۔

جب اُتار دے گا جب اور پی لینا۔ جوزف بولا۔ اب میں ایک بوند نہ دوں گا۔

گھیسو نے اپنے خالی گلاس کی طرف دیکھ کر رمضانی سے کہا۔ میرا گلاس خالی ہے۔

اور خالی رہے گا! جوزف سختی سے بولا۔

ایک روپیہ دے! گھیسو نے رمضانی سے کہا۔

رمضانی نے جیب سے پچیس روپے نکال کے کہا۔ ایک نہیں پچیس دیتا ہوں۔

گھیسو نے ایک لمحے کے لیے پچیس روپوں کی طرف دیکھا، ایک لمحے کے لیے رُکا۔ پھر اس کا ہاتھ بے ختیار پچیس روپوں کی جانب بڑھ گیا جلدی سے اُس نے روپے جیب میں ڈال کے کہا۔ چلو گھر صاتھ چلا ہوا۔ لے بھیّا جو وقت اب تو شراب دے دے۔

رمضانی میرے گلے میں رسی ڈالے ہوئے مجھے لے جا رہا تھا۔ اور ملک ملک کر گا رہا تھا۔ ؎

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

یکایک میں نے کہا۔ ؎

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

یکایک رمضانی نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ میری طرف دیکھا۔ پھر مجھے رسی سے کھینچتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ اُس کے چہرے پر میں نے خوف کی اک ہلکی سی جھلک دیکھی اب رات کا جھٹپٹا بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے دل کے خوف کو رمضانی زور زور سے گاتے ہوئے مجھے لے جا رہا تھا۔ اور دہرا رہا تھا ؎

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھ وہ دل نہیں رہا

میں نے پھر کہا۔ ذرا بلند آواز میں ! ؎

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

رمضانی خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس نے اِدھر اُدھر راستے میں دیکھا۔ مگر کسی کو موجود نہ پا کر رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں چلا کر بولا
"کون بولتا ہے ؟"

میں نے کہا۔ "میں ہوں ایک گدھا !"

تم ——— تم ؟ رمضانی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "تم ایک گدھے ہو کر انسانوں کی بولی بولتے ہو ؟"

میں نے کہا۔ میں نے عہد کر رکھا تھا کہ انسانوں کی بولی کبھی نہیں بولوں گا۔ لیکن جب جان پہ بن آتی ہے۔ اور انسان کی بے وفائی آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ تو غالب کے ساتھ کہنا ہی پڑتا ہے۔ ؎

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ رمضانی نے زور سے کہا۔ اور گھبرا کر اُس نے اپنے ہاتھ سے رسّی چھوڑ دی۔ اور پھر میری طرف پیٹھ کر کے اس تیزی سے بھاگا کہ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور اُسے بلاتا ہی رہ گیا۔

"رمضانی بھیّا۔ ذرا سنو تو اے رمضانی!"

مگر اُس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور خوف سے وحشیانہ طریقے سے چیختا ہوا کچھ پڑھتا ہوا وہاں سے ہوا ہو گیا . . .

. . . . میں سر جھکا کر ہولے ہولے قدموں سے واپس چلنے لگا۔ اور چند منٹ کے بعد جوزف کے جھونپڑے کے باہر پہنچ گیا۔ مگر گیسو گھسیارا اُس وقت وہاں سے جا چکا تھا اور کرنیل سنگھ بھی۔ اس وقت اکیلا جوزف اپنے جھونپڑے کے باہر لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھا ہوا آخری جام پی رہا تھا۔ اُس نے جو مجھے دیکھا۔ تو لپک کر آگے بڑھا اور میری رسّی اپنے ہاتھ میں لے کر بولا :-

رسی تڑوا کے اپنی جان بچالائے۔ مگر بچ کے کہاں جاؤ گے۔ میاں گدھے!
صبح تم کو رمضانی کے حوالے کر دوں گا۔
یہ کہہ کر اس نے مجھے ناریل کے ایک پیڑ سے باندھ دیا۔ میں نے
دفعتہً دیکھ کر جوزف سے کہا۔ جوزف!
ہائیں! وہ حیرت سے چیخا۔
میں نے کہا۔ چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک پڑھے لکھے آدمی
اس لیے میں تم سے گفتگو کرتا ہوں۔ اور تم سے کہتا ہوں۔ کہ یہ میں گدھا ہی
بول رہا ہوں۔
کیا میں نشے میں ہوں؟ جوزف نے اپنے آپ سے پوچھا۔
نشے میں تو ہو۔ مگر یہ بالکل سچ ہے کہ اس وقت تمھارا نشہ نہیں بول
رہا ہے۔ یہ خاکسار بول رہا ہے۔ بچپن میں میں نے انسانوں کی بولی سیکھ لی
تھی۔ یہ کہہ کر میں نے جوزف کو اپنی تھوڑی سی بپتا کہہ سنائی۔
وہ میرا حال سن کر بولا۔ گوڈ گاڈ! بالکل یقین نہیں آتا۔ مگر اب تمھیں
اپنے سامنے اپنے کانوں سے جو بولتا سن رہا ہوں تو یقین کرنا پڑتا ہے
کہ تم وہی مشہور و معروف گدھے ہو جس نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی تھی
اب یاد آرہا ہے۔ میں نے اس کے متعلق اخباروں میں بھی پڑھا تھا۔ فرما گئے

میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

میں نے کہا۔ تم رمضانی کے ہاتھوں میری جان بچا سکتے ہو؟

"وہ کس طرح؟" جوزف نے پوچھا۔ رمضانی نے پچیس روپوں میں تمھیں گھیسو سے خرید لیا ہے۔

پچیس روپوں میں کیا تم میری جان لے لو گے؟

بمبئی میں دادا لوگ تو دس روپے میں جان لینے کو تیار رہتے ہیں وہ بھی ایک انسان کی جان۔ تم تو ایک گدھے ہو۔ گو پڑھے لکھے ہو۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ جنگ عظیم میں میں ایک سپاہی تھا۔ میں نے خ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لاکھوں انسانوں کو چند روپوں کی خاطر خون اور کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا۔ تم تو محض ایک گدھے ہو!

وہ بھی گدھے تھے! میں نے تلخ تر لہجے میں کہا۔ اگر حساب لگاؤ تو کے حساب سے انسانوں کی زندگی بھیڑ بکریوں سے بھی سستی بکتی ہے۔ ہیر کے ایک بم نے ایک لاکھ جانیں لے لیں۔ ذرا حساب لگاؤ فی کس پچیس بھی نہیں پڑیں گے۔

جوزف بولا۔ اس حساب سے تمھیں خوش ہونا چاہیئے۔ کہ ایک گدھے زندگی کی قیمت ایک انسان کی زندگی سے زیادہ بڑھ رہی ہے۔

میں نے اُس کی بات ان سُنی کرکے کہا۔ اُن لوگوں نے سب کاریں لاکھوں
افون کو مشین گنوں سے بھون دیا۔ اگر وہ اُن کا گوشت بکری کے گوشت
ملا کے بیچتے تو اُنھیں زیادہ منافع ہوتا اور منافع ہی تو وہ چاہتے ہیں۔
"تم کیسی بھیانک باتیں کرتے ہو!" جوزف چلایا۔
اتنی بھیانک نہیں جتنی کہ یہ زندگی ہے۔ جب میں پچیس سو پوں کی
ایک سے گلے کی رسّی دوسرے کے ہاتھ میں تھما دی جاتی ہے۔
تم کیا چاہتے ہو؟
میں زندہ رہنا چاہتا ہوں! اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ میری طرح کے
وڑوں لوگ اِس دُنیا میں موجود ہیں۔ جو بے حد سادہ لوح اور بزدل ہیں۔
بے گدھے ہیں۔ لیکن ہم سب زندہ رہنے کا حق مانگتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی
نے گلے میں رسّی نہیں چاہتا!
خدائی فوجدار نہ بنو۔ جوزف بولا۔ صرف اپنی بات کرو۔
"میں چاہتا ہوں۔ کہ تم مجھے رمضانی سے خرید لو۔"
واہ ایک گدھے کی جان بچانے کے لیے رمضانی کو پچیس روپے دے دو،
یا گدھا نہیں ہوں میں! جوزف بگڑ کر بولا۔
تم میری بات پوری سن لینے پر کچھ کہے۔ میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے ۔ اگر تم مجھے رضامندی سے خرید لو گے ۔ تو میں
ٹھٹرا بغیر تلاشی کے ماہم کریک کی پولیس چوکی کے پار پہنچا دیا کروں گا ۔
تک تم اس کام کے لیے انسانوں سے کام لیتے رہے ہو ۔ جو کبھی نہ کبھی پو
کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں ۔ انہیں سزا ہو جاتی ہے ۔ اور تمہاری شرا
پکڑی جاتی ہے ۔ لیکن اگر اس کام کے لیے تم مجھے نوکر رکھ لو گے ۔ تو میں
سے وعدہ کرتا ہوں کہ پولیس ایک بار بھی مجھے پکڑ نہ سکے گی ۔

وہ کیسے ؟

بہت آسان کام ہے ۔ مگر اس کے لیے تمہیں اپنا ایک اڈہ باندرہ
میں اور دوسرا ماہم کریک کے باہر ماہم کے علاقے میں قائم کرنا پڑے گا ۔
جوزف بولا ۔ تم اس کی فکر نہ کرو ۔ وہاں پہلے سے کئی اڈے موجود ہ

ہمارے !

میں نے کہا ۔ تو پھر تو اس تجویز پر عمل کرنا انتہائی آسان ہے ۔ اور
حیرت ہے آج تک کسی سمگلر کو ایسی عمدہ تجویز کیوں نہیں سوجھی ۔
جوزف نے بے چینی سے کہا ۔ اب تم باتیں نہ کرو ۔ جلدی سے ا
تجویز سمجھاؤ ۔

تجویز بے حد آسان ہے ۔ تم صرف اتنا کرو کہ علی الصبح مجھے جو گیتو

سے باندرہ کے اڈے پر لے جاؤ۔

اچھا۔

پھر وہاں صبح سویرے نہار منہ میرے خالی معدے کو شراب سے بھر دو حلق تک۔ میرے معدے اور آنتوں میں کئی گیلن شراب سما سکتی ہے۔ اس لیے جب حلق تک شراب بھر جائے۔ تو مجھے ماہم کریک تک لے جا کے چھوڑ دو وہاں سے میں خود آہستہ آہستہ ایک آوارہ بے مالک گدھے کی طرح چلتا ہوا پانچ منٹ میں پولیس چوکی پار کر جاؤں گا۔ پولیس کو ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہ ہوگا کہ اس گدھے کے پیٹ میں اتنے گیلن شراب بھری ہوئی ہے۔ وہ تو صرف انسان ——— اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لیتے ہیں مگر ایک ننگے گدھے پر جس کے بدن پر کپڑے کا ایک چیتھڑا تک نہیں ہے اس پر انہیں کیسے شبہ ہوگا۔ لہٰذا میں ہر روز پولیس چوکی سے بے خوف و خطر گزر جایا کروں گا۔

پھر؟

پھر ماہم کے اڈے پر پہنچ کر تم میرے حلق میں ربڑ کی نالی ڈال کر بذریعہ پمپ شراب نکال لیا کرنا۔ اور اپنے گاہکوں میں تقسیم کر دیا کرنا۔

کیا میرے گاہک ایک گدھے کے پیٹ سے نکلی ہوئی شراب پینا پسند

کریں گے!

میں نے کہا۔ احمق ہوئے ہو۔ جو لوگ گندی موریوں میں دبائی ہوئی بوتلوں اور گندے سڑے پیپوں کی شراب پیتے ہیں۔ جو لوگ سائیکل کی گلی اور پرانی ٹیوبوں میں لے جائی گئی شراب ڈکار جاتے ہیں۔ انھیں ایک گدھے کی آنتوں سے نکلی ہوئی شراب پینے میں کیا عذر ہوگا۔ صبح سویرے میرا ببو کا خالی معدہ بہرحال گلی سڑی ٹیوبوں سے تو زیادہ صاف ستھرا ہوگا۔

اور تمھیں نشہ نہیں ہوگا کیا؟

پانچ منٹ میں کیا نشہ ہوگا۔ ماہم کریک کلاس کرنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگیں گے۔ یوں سوچو کہ میرا پیٹ ایک پیٹرول لے جانے والی لاری کا بڑا ڈرم ہے۔ باندرہ ریک خلنگ سٹیشن ہے۔ باندرہ پر تم اس ڈرم کو بھر دیتے ہو۔ ماہم پر خالی کرا لیتے ہو۔ بے حد بلدہ آسان سستی کارآمد محفوظ اور سائنٹیفک تجویز ہے۔

گاڈ بلیس یو! جوزف نے ایک منٹ سوچنے کے بعد کہا۔ پھر اس نے خوشی سے دونوں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ کیا ترکیب بتائی ہے تم نے! ——— ایک سمگلر گدھا! ——— پولیس قیامت تک شبہ نہیں کر سکتی۔ ہولی کرائسٹ۔ میں تو ایک ہی سال میں لکھ پتی ہو سکتا ہوں۔

فرطِ مسرت سے جوزف میرا منہ چومنے لگا۔ اب تو میں ضرور لکھ پتی بن جاؤں گا۔ اب تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ اب تو میں پچیس کیا سو روپے رمضانی کو دے کر تمہیں اس سے خرید لوں گا۔

"وہ اس لیے کہ پہلے میں محض ایک گدھا تھا۔ اور اب میں ایک منافع بخش تجویز ہوں۔ اور جب انسان کو منافع نظر آنے لگے تو وہ ایک گدھے کا منہ بھی چوم سکتا ہے!"

اندر آجاؤ! جوزف نے میری رسّی اپنی لکڑی کے گرد مضبوطی سے باندھتے ہوئے کہا۔ میں تمہیں باہر ناریل کے پیڑ کے نیچے باندھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ ممکن ہے تمہیں سردی لگ جائے۔ تمہارے بدن پر تو ایک کپڑا تک نہیں ہے!

میں نے کہا۔ دنیا میں کروڑوں بے گھر گدھے ننگے یا ادھ ننگے کھلے آسمان تلے سوتے ہیں۔

"اجی گولی مارو ان گدھوں کو۔ میں تو تمہیں آج اپنے چھپر کے اندر سلاؤں گا۔"

مگر چھپر کے اندر تو بڑی گندگی ہو گی! میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

میں آپ کے لیے چھت کا پنکھا کھول دوں گا۔ مٹر لکی سر!

جورت نے مجھے بڑی عاجزی سے کہا۔ اور پھر بڑے پیار سے میری
گردن سہلاتا ہوا مجھے چھپر کے اندر لے گیا۔

"شروع ہونا سمگلنگ کے دھندے کا اور یاد کر جانا گدھے کا
ماہم کریک کر پاکستانی۔ اور پڑ جانا ہاتھوں میں سیٹھ جھوٹی لل
کے۔ اور بیان ماہم کے سٹے بازوں کا۔"

کم بخت جوزف نے رات بھر مجھے بھوکا رکھا۔ صبح بھی گھاس کا ایک تنکا تک توڑنے نہ دیا۔ اور صبح ہی مجھے باندرسے کے خیمہ اڈے پرلے گیا۔ باندرہ تک پہنچتے پہنچتے بھوک سے میں بے حال ہونے لگا۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ اور میرا پیٹ پچک کر پسلیوں سے جا لگا۔

میری یہ حالت دیکھ کر جوزف بے حد خوش ہوا۔ کیونکہ میرا پچکا ہوا پیٹ اس بات کی ضمانت تھا کہ میرا معدہ بالکل خالی ہو چکا ہے۔ مجھے بھی شروع ہی سے اس بات کا خیال تھا کہ اس کام میں مجھے دن میں صرف ایک بار کھانا ملا کرے گا

اور وہ بھی صبح دس گیارہ بجے۔ اپنے کام سے فارغ ہو جانے کے بعد۔ مگر میں نے یہ سوچ کے صبر کر لیا تھا کہ اس دنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں۔ جنہیں دن بھر کی محنت کے بعد صرف ایک وقت کی روٹی ملتی ہے۔ میں تو ایک گدھا ہوں۔ مجھے اگر دن بھر کی مشقت کے بعد ایک وقت کی گھاس مل جائے۔ تو کیا بڑا ہے! یہی سوچ کر میں نے صبر کر لیا تھا۔

باندرہ کے خفیہ اڈے پر پہنچ کر جوزف نے پوچھا۔ اب کیا کریں؟

میں نے کہا۔ اب ایک بالٹی بھر کے شراب میرے سامنے رکھ دو۔ میں اُسے پی جاؤں گا۔

جوزف ایک چھپر کے اندر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس چھپر کے اندر سے دو آدمی باہر نکلے۔ ایک جوزف تھا۔ دوسرا اُس کا دوست کامتا پرساد تھا۔ یہ ایک دبلا پتلا دھوتی باندھے ہوئے ٹھگنا تھا۔ اس کی ایک آنکھ کانی تھی۔ دوسری شفاف نیلی تھی۔ یہ دوسرا آدمی بڑا چار سو بیس اور کائیاں معلوم ہوتا تھا دونوں نے دو بالٹیاں اُٹھا رکھی تھیں۔

پہلے میں نے ایک بالٹی پی۔ پھر دوسری۔ پھر کامتا پرساد تیسری اُٹھا لایا وہ بھی کسی نہ کسی طرح میں نے پی لی۔ پھر کامتا پرساد چوتھی اُٹھا لایا۔ میں نے انکار کر دیا۔

تم کوشش تو کرو۔ کامتا پرساد نے مجھے ڈھارس دیتے ہوئے کہا جتنی شراب تمہارے پیٹ میں جا چکی ہے۔ اُتنی شراب تو ایک نگڑا شرابی صبح سے شام تک پی لیتا ہے۔ تم گدھے ہو کر ایک بالٹی اور نہیں پی سکتے۔

نہیں! میں نے بیزار ہو کر کہا۔ میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔

خیر نہ سہی۔ کامتا پرساد نے مڑ کر جوزف سے کہا۔ اِسے ہر روز رات کو ایک عمدہ سا جلاب دینا چاہیئے۔ فروٹ سالٹ! یا کوئی ایسی ہی چیز۔ صبح کو اس کا پیٹ ایسا صاف ہو جائے گا کہ بآسانی چوتھی بالٹی کی شراب اس کے پیٹ کے اندر سما سکے گی۔

میں نے کہا۔ اب مجھے جلدی سے یہاں سے لے چلو۔ ڈر ہے کہیں مجھے نشہ نہ ہو جائے۔ سُنا ہے خالی پیٹ یوں بھی نشہ بہت ہوتا ہے۔

اُن دونوں نے جلدی سے مجھے باندرہ کی مسجد کے چند قدم آگے لے جا کر چھوڑ دیا۔ اور میں ایک آوارہ گدھے کی طرح جھومتا جھامتا اِدھر اُدھر سر مارتا سڑک سونگھتا پولیس چوکی کی طرف بڑھنے لگا۔

صبح کا وقت تھا۔ سمندر سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کریک کے پانیوں پر ماہی گیروں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ بادبانی کشتیاں سامان سے لدی ہوئی کھلے سمندر میں جا رہی تھیں اور چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پھولدار فراک پہنے

ہوئے چڑیوں کی طرح چہکتی ہوئیں سکول جارہی تھیں۔

ایسا خوب صورت منظر تھا۔ کہ میرا دل خوشی سے اترانے لگا۔ اور جی چاہا کہ شدھ آسا کی لے میں ایک ایسی تان چھیڑوں جو حلق سے نکل کر سارے آسمان کے بادلوں تک پہنچ جائے۔ بغیر کسی سمگلنگ کے ..... مگر فی زمانہ یہ ناممکن ہے۔ تجارت نے ہر شئے کو اس قدر محصور کر لیا ہے کہ آجکل کوئی معمولی سے معمولی شئے بھی بغیر پرمٹ کے۔ کوٹے کے۔ سمگل کے۔ رشوت کے اِدھر سے اُدھر نہیں کی جا سکتی۔ کلاسیکل موسیقی کو بھی آجکل ریڈیو والے لائیٹ میوزک کے پروگرام میں سمگل کر کے پیش کرتے ہیں!

میں یونہی سوچ رہا تھا اور اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ کہ اتنے میں میری نظر ایک مراٹھی عورت پر پڑی۔ اور میں اُس کے حسن و جمال کو دیکھ کر وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے گہرے سبز رنگ کی نوگزی مراٹھی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اُس کے اُودے بلاؤز پر سونے کا منگل سوتر چمک رہا تھا۔ وہ سونے کی چمکتی ہوئی نتھ پہنے ہوئے تھی۔ اور اپنے ایک ہاتھ میں تھالی اُٹھائے ہوئے اُس میں روشن دیئے اور پھول رکھے ہوئے مندر کو جا رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر صبح کے گلاب کھلے ہوئے تھے اور اُس کی بالائی کی طرح سپید دینی میں سے

چمپا کی مہک آتی تھی۔ اور وہ اپنی لانبی لانبی پلکیں جھکائے ایسی باحیا، بقدس اور شرمیلی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے وہ اس دُنیا کی مخلوق نہ ہو۔ کسی دُور دراز کے آسمان کی اپسرا ہو۔ میں تو اُسے دیکھتے ہی مبہوت ہو گیا اور ہولے ہولے اس کے پیچھے چلنے لگا۔

پولیس چوکی پر خاصی بھیڑ تھی۔ بہت سی ٹیکسیاں، گاڑیاں، اور ٹرکیں رُکی ہوئی تھیں۔ پولیس کے سپاہی باری باری ہر ایک گاڑی اور ٹرک کو اندر باہر غور سے دیکھنے۔ جائزہ لینے۔ اور پھر اسے آگے بڑھنے کا موقع دیتے۔

اب پولیس والوں نے ایک ٹیکسی کی ڈگی کھلوا لی تھی۔ اور غور سے اُس کے سامان کی تلاشی لے رہے تھے۔

وہ خوب صورت عورت پولیس کے سپاہیوں کے قریب جا کر ذرا سی ٹھٹھکی اُس نے اپنی تھالی کا توازن اپنے بلند ہاتھ پر ٹھیک کیا اور نظریں جھکائے آگے بڑھنے لگی۔ پولیس والوں نے ذرا پیچھے ہٹ کر اُسے راستہ دے دیا۔

اتنے میں پیچھے سے پولیس کی ایک عورت کی آواز آئی۔ اے کھڑے؟

وہ خوب صورت عورت مُڑ کر دیکھنے لگی۔

پولیس کی عورت نے اُس سے کہا۔ اکیلے ای؟؟

وہ خوب صورت حسینہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پولیس کی عورت نے

اُس کے قریب پہنچ کر اُس کے چہرے کو غور سے تاک کر کہنے لگی

"کہاں جا رہی ہو؟"

"مندر!"

پولیس کی عورت نے پھرتی سے ایک ہاتھ اُس خوب صورت عورت کے گداز کولھے پر مارا۔ مجھے اُس عورت کی یہ حرکت بے حد بُری معلوم ہوئی۔ کس قدر بدتمیز عورت ہے یہ پولیس کی؟ میں ابھی یہاں تک سوچ پایا تھا کہ پولیس کی عورت نے دوسرا ہاتھ اُس کی پیٹھ پر مارا۔ دوسرے ملے میں وہ اُس کی نوگزی ساڑھی کے اندر سے شراب سے بھری ہوئی ربڑ کی ٹیوبیں برآمد کر رہی تھی۔ جو اُس عورت کے پیٹ کے اردگرد بندھی ہوئی تھیں۔

"یہ۔۔۔ تم ٹھرا لے کر مندر جاتی ہو۔" پولیس کی عورت نے طنزاً کہا اور وہ خوب صورت عورت زور زور سے رونے لگی۔

پولیس کے ایک سپاہی نے میری پیٹھ پر ڈنڈا مارتے ہوئے کہا۔ "ابے یہ گدھا یہاں کیا کر رہا ہے؟"

ڈنڈا کھاتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ اور ماہم کے چوک تک دوڑتا ہُوا چلا گیا۔ جہاں جوزف اور کانتا پرساد پہلے ہی سے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ جوزف نے میرے گلے میں رسّی ڈال دی۔ اور مجھے کھینچ کر ایک تنگ سی

گلی میں لے گیا۔ وہاں جا کر اُنھوں نے مجھے ایک تاریک مکان کے اندر دھکیل دیا۔ یہ پُرانی وضع کا ایک تاریک سا مکان تھا۔ کچھ عرصہ تک اُنھوں نے مجھے اُس کی تاریک ڈیوڑھی میں کھڑا رکھا۔ پھر کامتا پرساد نے ڈیوڑھی کے اندر کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

کون ہے؟ اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

میں ہوں کامتا پرساد!

دروازہ کھل گیا۔ اور اُس میں سے بادامی رنگ کا بلاؤز اور گہرے سُرخ رنگ کا سایہ پہنے ہوئے ایک نوجوان عورت برآمد ہوئی۔ اُس کے ہونٹ گہرے سُرخ تھے اور بڑی بڑی آنکھیں گہری سیاہ۔ اُس نے مست ادا سے اپنے دونوں کولھے مٹکائے۔ اور بولی،

"خالی ہاتھ آئے ہو؟"

ماریا۔ تم دروازہ تو کھولو! جوزف نے بڑی بے چینی سے کہا۔ اور خود پرے ہٹ جاؤ۔

ماریا نے دروازہ پوری طرح سے کھول دیا۔ اور پرے ہٹ گئی۔ وہ دونوں مجھے کھینچ کر اندر لے گئے۔ اندر ایک کشادہ صحن تھا جس کے ایک کونے میں آگ جل رہی تھی۔ اور ایک کونے میں بہت سے ڈرم پڑے تھے۔

اور ایک کونے میں النگی پہ ڈھلے ہوئے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ اور ایک کونے میں ایک کھاٹ پر ایک بڈھا آدمی سو رہا تھا۔

کامتا پرساد ماریا کے ساتھ ایک طرف کے برآمدے میں غائب ہوگیا تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ربڑ کی لمبی ٹیوب لے کر باہر آئے۔ پھر ان دونوں نے میرے منہ کے نیچے ایک بڑا ڈرم رکھ دیا۔ اور میرے معدے میں ٹیوب ڈال کر شراب باہر نکالنے لگے۔

ماریا نے جو میرے منہ سے شراب نکلتی دیکھی۔ تو پہلے حیرت سے اُس کی بڑی بڑی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر وہ قہقہہ مار کر اتنی ہنسی اتنی ہنسی کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

جوزف نے ماریا کے کولھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اور بولا۔ کیا اب بھی تمھیں کوئی شبہ ہے ماریا۔ کہ اب میں بہت جلد امیر ہو جاؤں گا۔ پھر تو تم مجھ سے شادی کر سکو گی نا؟

دیکھیں گے! ماریا نے ہاتھ مار کر جوزف کے ہاتھ کو اپنے کولھے سے ہٹا دیا۔ اور میرے قریب آکر بولی۔ کیا سدھایا ہے تم نے اس جانور کو۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم اس قدر عقلمند ثابت ہوگے جوزف؟

ماریا کی نگاہوں میں واقعی حیرت تھی۔ اور تعریف۔ جوزف خوش ہوکر

اب تو مجھ سے شادی کر لو۔!

ماریا ہنستے ہوئے پرے ہٹ گئی۔ بولی۔ فی الحال تو میرا ارادہ اِس گدھے سے شادی کرنے کا ہو رہا ہے! یہ گدھا تو سونے کی کان ہے!

تھوڑی دیر کے بعد کامتا پرساد نے شراب کو بالٹیوں میں بھر کر کہا۔ پونے تین بالٹی شراب واپس ملی ہے۔ ایک چوتھائی یہ گدھا ہضم کر گیا۔

ماریا نے ہنس کر کہا، شکر کرو۔ یہ گدھا ہے۔ کوئی شرابی آدمی نہیں ہے ورنہ پوری شراب ہضم کر جاتا!

جوزف بولا۔ ایک چوتھائی پانی ڈال دو۔ کیا پتہ چلے گا۔

میں نے سوچا۔ دودھ میں پانی۔ شراب میں پانی —— ؟؟

کامتا پرساد نے پوچھا۔ سیٹھ کہاں ہے؟

ماریا نے کامتا پرساد کے کان میں کچھ کہا۔ پھر کامتا پرساد اور ماریا برآمدے کے اندر چلے گئے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھ کر جوزف سے کہا۔ مجھے جلدی سے گھاس دے دو۔ ورنہ میں ابھی بھوک سے گر جاؤں گا۔

میں نے سب بندوبست کر رکھا ہے پارٹنر! جوزف بڑے پیار سے میرا کان اینٹھتے ہوئے بولا ہے ماریا! اندر سے گھاس لیتی آؤ۔

ماریا اپنی دونوں گوری گوری باہنوں میں گھاس کے خوشے بھر بھر کر

لاتی اور اپنے ہاتھوں سے مجھے گھاس کھلانے لگی۔ کئی بار اُس کی نازک انگلیاں میرے ہونٹوں سے جا لگیں۔ ایک بار تو میری زبان اُن سے چھُو گئی۔ آہ! اُن انگلیوں کا ذائقہ کتنا ملائم اور لطیف تھا۔ جیسے اوائل بہار میں کہستانی وادیوں میں اُگنے والی گھاس کے پہلے خوشوں کا ہوتا ہے۔!

دو دن بعد کامتا پرساد ربڑ کی ایک موٹی ٹیوب اور ایک بڑا سا سینڈ پمپ لے آیا۔

بولا۔ یہ گدھا کام چور ہے۔ یقیناً اس گدھے کے معدے میں کئی گیلن شراب زیادہ سما سکتی ہے۔

جوزف نے اعتراض کیا بے چارہ جہاں تک بھر سکتا ہے بھر لیتا ہے۔

جی نہیں۔ کامتا پرساد نے کہا۔ ہم اس پمپ کے ذریعے اس گدھے کے معدے میں شراب بھریں گے جس طرح موٹر ٹیوب میں ہوا بھری جاتی ہے۔ میں نے کہا "میرا پیٹ ایک جاندار کا پیٹ ہے۔ وہ موٹر ٹیوب نہیں ہے"۔ مگر میری ایک نہ سنی گئی۔ اُن لوگوں نے میرے منہ میں ٹیوب ڈال کر بذریعہ پمپ شراب بھرنا شروع کی۔ اور آہستہ آہستہ میرا پیٹ پھولنا شروع

ہوًا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری آنتیں ربڑ کے ٹائروں کی طرح پھوُل گئی ہیں۔ میرا معدہ ایک ڈھول کی طرح پھوُل کر کپّا ہوتا جا رہا ہے جب شراب میرے حلق سے باہر چھلکنے لگی۔ جب جا کے اُن کم بختوں نے میرا پیچھا چھوڑا۔

کامتا پرساد نے مسکرا کر فاتحانہ انداز میں کہا۔ پورے چھ بالٹی شراب میں نے بھری ہے۔ پہلے سے دُگنی۔

جوزف نے کہا۔ گویا ہم پہلے سے دُگنا منافع کمائیں گے!

"ارے ظالمو۔ میرا پیٹ پھٹ جائے گا" میں نے درد اور تکلیف سے چلّا کر کہا۔

جوزف نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ صرف پانچ منٹ کا تو راستہ ہے یوں چٹکیوں میں طے ہو جائے گا۔ اب ہم تم کو ماہم کے چوک پر مل جائیں گے۔ کامتا پرساد نے کہا۔ اگر ہم دو چار منٹ دیر میں پہنچیں تو فکر مت کرنا پھر وہ جوزف کی طرف مُڑ کر بولا۔ اِس خوشی میں ایک ایک پیگ ہو جائے!

ہو جائے!

اُن دونوں کو پیتے چھوڑ کر میں ماہم کریک کی جانب روانہ ہو گیا۔ آج کوئی خاص واقعہ نہیں ہوًا۔ اور میں پہلے دو دنوں کی طرح چوکی سے بے خوف و خطر

گزر گیا۔ اور ماہم کے چوک پر پہنچ کر ایک فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر جوزف اور کامتا پرساد کا انتظار کرنے لگا۔

جہاں میں کھڑا تھا۔ وہاں ٹیکسیوں کا اڈہ تھا۔ اڈے کے پیچھے فٹ پاتھ پر ایک کبابیا تکّے اور کباب اور پراٹھے لے کر بیٹھا تھا۔ قریب میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ جس پر چند مشتبہ قسم کے لوگ صبح کا ناشتہ کے لیے کباب اور پراٹھے کھا رہے تھے۔ اور سٹے کے نمبروں کی باتیں کر رہے تھے۔

میں نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور ایک طرف کھڑا ہو کر جوزف اور کامتا پرساد کا انتظار کرنے لگا۔ میں اپنے جسم میں شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ ہر لحظہ ایسا گمان ہوتا تھا۔ گویا میرا پیٹ ابھی ابھی پھٹ جائیگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جلدی سے جوزف آئے اور مجھے اُس اندھیری گلی میں لیجا کر میرا پیٹ خالی کر دے۔ اب میں اُس گھڑی پر لعنت بھیج رہا تھا جب میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر یہ دھندا شروع کیا تھا۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ دس منٹ گزر گئے۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ مگر جوزف اور کامتا پرساد کہیں دکھائی نہ دیئے۔

ہولے ہولے میرا نشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ شراب میری رگ رگ میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا

جیسے میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں۔ پہلے تو میں نے عالم سرور میں زور کی ایک ہانک لگائی۔ جسے سن کر اردگرد کے سب لوگ اُچھل پڑے۔ پھر میں نے گانا شروع کر دیا۔

"آوارہ ہوں میں آوارہ......"

لوگوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولے۔گدھا گاتا ہے!

گیت کی دُھن پر میرے قدم خود بخود ناچنے لگے۔

"ارے ناچتا بھی ہے!!"

میں نے جھوم کر کہا: "یارو مجھے معاف کرنا میں نشے میں ہوں!"

میرا نشہ دمبدم بڑھ رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم بھی دمبدم بڑھ رہا تھا۔ میں نے بہک بہک کر چلانا شروع کیا: "دو گھونٹ میں نے پی اور سیر جنّت کی کر لی!"

"عجیب خوش مذاق گدھا معلوم ہوتا ہے" ایک شخص بولا۔

دوسرے نے کہا: "بیسویں صدی کا معجزہ ہے یارو۔ انسان کی طرح بولتا ہے!"

یہ بمبئی ہے بمبئی۔ تیسرے نے کہا۔ یہاں گدھے بھی آ کر انسانوں کی طرح بولنے لگ جاتے ہیں۔

چوتھے شخص کو میں نے پہچان لیا۔ یہ جیکن کا گودام کے پینے ہوئے تھا جس میں

سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اور نہایت نفیس، باریک ململ کی دھوتی زیب تن تھی۔ اس شخص نے اپنے ساتھی کو جو تہمد پہنے ہوئے تھا کہا "جمّی! تم نے آج تک کوئی بولتا ہوا گدھا دیکھا ہے؟"

"نہیں سیٹھ بھسوڑی مل آج تک تو نہیں دیکھا۔ قسم لے لو!"

سیٹھ بھسوڑی مل اور جمن دونوں کو میں کبابئے کی دکان کے قریب چلوبانی پر سیخ کباب پراٹھے کھاتے دیکھ چکا تھا۔

سیٹھ بھسوڑی مل نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یار جمّن مجھے تو کچھ گول مال لگتا ہے۔

"کیسا گول مال سیٹھ؟"

میرے خیال میں یہ گدھا نہیں ہے۔ کوئی یوگی سادھو سنت مہاتما معلوم ہوتا ہے۔ جس نے ہم دنیا داروں سے بچنے کے لیے گدھے کا بھیس دھارا ہے۔

جمّن بولا۔ تم ٹھیک کہتے ہو سیٹھ۔ مجھے بھی کوئی باکمال عامل معلوم ہوتا ہے۔ جس نے قبر سے کسی روح کو نکال کر اس گدھے کے جسم میں قید کر دیا ہے۔

سیٹھ بھسوڑی مل بولا۔ آؤ۔ اس کے پاؤں پڑ جائیں۔ اور اس سے سٹے کا نمبر دریافت کر لیں۔

یہ کہتے ہی سینکڑوں لوگوں کے سامنے سیٹھ بھسوڑی مل نے میرا ایک پاؤں پکڑ لیا۔ اور فرطِ محبت سے تقدس آمیز لہجے میں بولا" میں نے پہچان لیا۔ یوگی مہاراج۔ میں نے پہچان لیا۔

جگن نے میرا دوسرا بازو پکڑ کر کہا کرامت والے فقیر دستگیر کرم کر دے بیٹے کا نمبر بتا دے۔

ہٹو۔ یہ کیا بکواس ہے! میں نے نشے کے باوجود اپنا پاؤں پرے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا۔ سیٹھ بھسوڑی مل نے مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے میرا پاؤں پکڑ کر اسے چومتے ہوئے کہا۔ جب تک بیٹے کا نمبر نہیں بتاؤ گے نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک اپنے گیان میں انتردھیان ہوکر نمبر نہیں بتاؤ گے۔ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔

جگن نے میرے دوسرے پاؤں کو بوسہ دے کر کہا۔ تیرے رحم و کرم کا صدقہ ایک نمبر اس غریب کو بھی عطا کر دے! اگر تو جلال پہ آجائے تو بندہ نہال ہو جائے!

ان کی دیکھا دیکھی دو تین اور آدمی میرے پاؤں پہ گر پڑے اللہ رو رو کر التجا کرنے لگے۔

۱... تجھے چینڈ سلوا دونگا ساٹن کا۔

۲..... اگر نمبر بتا دے کاٹن کا۔

۳..... تجھے حلوا کھلاؤں گا ہر روز۔

۴..... ایک بار بتا دے اوپن ٹو کلوز!

نمبر... نمبر... کی بے تاب آوازیں مجمع میں سے بلند ہوئیں۔ مجمع میرے گرد بڑھ رہا تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بمبئی میں لوگ سٹے کے کتنے عاشق ہیں اب نمبر بتائے بغیر جان کیسے چھوٹے گی۔ کوئی دم میں پولیس آیا چاہتی ہے۔ اور میرا پیٹ، ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ابھی ابھی پھٹ جائیگا۔

میں بہت سے نقلی فقیروں جوتشیوں اور سادھوؤں کو نمبر بتاتے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے میں نے دولتی کی ٹیکنک اس وقت اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ پہلے تو میں نے دولتیاں جھاڑ کر اپنے لیے جگہ بنائی۔ پھر میں جھوم جھوم کر ناچنے لگا اور اول جلول بکنے لگا۔

انتر منتر جنتر۔ کانگریس لیگ سوتنتر۔ نہ ہندو دیکھے نہ مسلم جانے کوئی چھری بھونکے کوئی خنجر تانے۔ ایک دل... دو بیانے مل گیا... مل گیا۔

سیٹھ بھوڑی مل خوشی سے چلاتا ہوا بولا۔ ایک دل دو بیانے یعنی اکے سے دوا......

نہیں چھمن مسرت کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ایک دل دو پیمانے یعنی ایک میں جمع دو کر دو تو ہوئے تین۔ اِسکے سے تیا۔

ارے نہیں تیسرا بولا۔ ایک دل دو پیمانے۔ دو سے ایک نکالو۔ باقی رہا ایک۔ اِسکے سے اکا آئے گا۔

غلط اچھا تھا بولا۔ نہ ہندسے سمجھے نہ مسلم جانے۔ بھئی نتیجہ صفر۔ یعنی کہ بندی آئے گی۔

سب لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نمبر لگانے کے لیے بھاگے۔ ایک منٹ میں مطلع صاف تھا۔ میں فٹ پاتھ پر اکیلا کھڑا تھا۔ اتنے میں سامنے سے ماریا، جوزف اور کاشتا پر سا دیکھتے ہوئے ......

جوزف نے گھبرا کر پوچھا۔ کیا ہوا تھا۔ لوگوں نے تمھیں کیوں گھیر لیا تھا؟

میں نے کہا۔ لاری کرا اور اوور لوڈ کر دو گے تو کیا انجن فیل نہیں ہوگا۔ تم نے مجھے اوور لوڈ کر دیا۔ نتیجے میں مجھے نشہ ہو گیا۔ اور میں اول جلول بکنے لگا۔ اب انسانوں کی بولی بولنے لگا۔ اور تمھاری دنیا ایسی ہے کہ یہاں اگر انسان گدھے کی بولی بولنے لگے تو کسی کو تعجب نہ ہوگا۔ لیکن اگر گدھا انسان کی طرح بات کرنے لگے تو ہر ایک کو تعجب ہوگا۔ اب جلدی سے میرے پیٹ سے شراب نکالو۔ ورنہ شاید میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

وہ لوگ جلدی سے مجھے گھسیٹ کر گلی میں لے گئے۔
ماریا کے گھر صحن کے اندر پہنچتے ہی میں لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

ہونا گرفتار سمگلنگ کے دھندے میں جوزف، ماریا اور کاشا پرساد کا۔ اور بھاگنا گدھے کا پولیس کے ڈر سے اور ملاقات کرنا پارسی باداگستم سیٹھ سے، اور بیان بمبئی کے ریس کورس کا۔

جب میں ہوش میں آیا۔ تو میں نے دیکھا کہ میں گلی کے باہر نکڑ پہ ایک گھٹنے میں بازار کی موری کے قریب پڑا ہوں میرے منہ سے جھاگ بہہ رہی ہے اور بازار کے چند لونڈے مجھ سے ذرا دُور کھڑے مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔

میں نے اچھی طرح سے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کان کھجائے ٹانگیں سیدھی کیں۔ تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا پیٹ بہت ہلکا ہو چکا ہے۔ اور میرا نشہ بھی قریب قریب اُتر چکا ہے۔

مگر جوزف۔ ماریا اور کامتا پرساد غائب تھے۔ اُن ظالموں نے میرے پیٹ

سے شراب نکال لی تھی ۔ اور غالباً مجھے مُردہ سمجھ کر گلی سے گھسیٹ کر میری لاش کو بازار کے کونے میں پھینک کر چلے گئے تھے ۔ یونہی ہوتا ہے ۔ بزنس کی دُنیا میں یہی ہوتا ہے ۔ جب کوئی مرد کام کے قابل نہیں رہتا تو اُسے ایک لاش کی طرح گھسیٹ کر بے کاری کے کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا جاتا ہے پہلے تو وہ آپ کے جسم سے زندگی کا عرق اور خون کی آخری بوند کڑی محنت کے جیب سے نکال لیتے ہیں ۔ پھر دھکا دے کر موری میں گرا دیتے ہیں ۔

جب انسان انسانوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں ۔ تو پھر میں تو ایک گدھا ہوں ۔ مجھے صبر کر لینا چاہیئے ۔ اور شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اُن لوگوں نے میری جان بخش دی ۔

مَیں یوں ہی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں مَیں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ سامنے ماہم کے چوک سے جوزف ، ماریا ، اور کانتا برسا چلے آ رہے ہیں ۔ تینوں کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ہیں اور اُن کے ساتھ پولیس کے دو سپاہی ہیں ۔

میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اتنے میں اُن لوگوں نے مجھے دیکھ لیا ۔

ماریا نے چلّا کر کہا " وہ رہا گدھا ! "

پولیس کا ایک سپاہی میری طرف بھاگا ۔

اُسے دیکھتے ہی مَیں بھی بھاگا ۔

پکڑو۔ پکڑو۔ پولیس کے سنتری نے شور مچایا۔

مگر میرے قدموں کو جیسے پَر لگ گئے تھے۔ میں خوف سے چیختا چلاتا ہنکتا، ہنہناتا، دولتیاں جھاڑتا۔ ماہم کے بازار کے بیچوں بیچ بھاگتا ہوا دوڑتا ہوا شواجی پارک تک چلا گیا۔ پولیس والے ایک جیپ لے کر میرا پیچھا کرنے لگے۔ مگر میں بھی اپنی روح کی پوری طاقت سے بھاگنے لگا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

میری نواس کے اڈے سے میں شواجی پارک کی طرف بھاگا۔جیپ
میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔میں نے ایک زقند بھری اور شواجی پارک کی دیوا
اچھل کر میدان میں آرہا۔جیپ چھلانگ نہ لگا سکتی تھی۔لہذا وہیں رُک گئی
پھر چکر کاٹ کر شواجی پارک کے دروازے کی جانب روانہ ہوگئی۔جو یہاں سے
بہت دُور تھا۔جب تک میں شواجی پارک کا میدان کراس کر کے فٹ بال
کھیلنے والی ٹیموں کے بیچ میں سے گزرتا ہوا، کرکٹ کی وکٹیں اُڑاتا ہوا، دو
سائیڈ کی دیوار پھلانگتا ہوا دوسری طرف جا پہنچا۔ادھر وہاں سے سرپٹ بھاگ

ہُوا۔ تیر کی طرح سنسناتا ہُوا ٹریفک کے تمام قوانین توڑتا ہُوا والی سی بیچ (WALI SEA BEACH) پر جا پہنچا۔

سمندر کے کنارے پہنچ کر میری ٹانگوں نے مجھے جواب دے دیا۔ اور میں بے لبس اور نڈھال ہو کر سمندر کے کنارے لیٹ گیا۔

وہاں کا نظارہ بہت خوب صورت تھا۔ تاحدِ نظر سمندر ایک نیم دائرے کی صورت میں پھیلا ہُوا تھا۔ اوپر آسمان محراب کی صورت میں جھکا ہُوا تھا۔ جس پہ شفق کی جھالریں اور رنگین بادلوں کی جالیاں آویزاں تھیں۔ اُن رنگا رنگ جھالروں اور بدلیوں کے شفاف جھلملاتے ہوئے حسن نے مجھے مسحور کر دیا۔ اور میں نے سوچا۔ یہ خوب صورتی مجھ سے کتنی دُور ہے۔ حسن کا عکسِ جمال کس قدر ماورا۔ بڑھتی ہوئی بھوک بے کاری اور جُرم کی اِس دُنیا میں ایک عام گدھے کے لیے کہیں آرام نہیں ہے۔ کیا کوئی ایسا زمانہ آئے گا جب میں حسن کی اس اُونچی محراب کو چھُو سکوں گا۔

ابھی تو ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ ابھی تو زندگی اکثر جگہوں پر ایک گدھے کی سطح سے اُوپر نہیں اُٹھی ہے۔ ابھی حسن بہت دُور ہے۔ انصاف کی محراب بہت اونچی ہے۔ اور میں ایک گدھا ہوں جس کا پولیس پیچھا کر رہی ہے!

میں نے تھک کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب جو ہو سو ہو۔ چاہے پولیس آئے اور مجھے گرفتار کرے۔ چاہے سمندر کی ایک بڑی اُچھال آئے اور مجھے اپنی لہروں میں سمیٹ کر سمندر کے نیچے پہنچا دے۔ اس وقت میں اس قدر تھک چکا ہوں۔ کہ ہر انجام کے لیے تیار ہوں۔

میرے کانوں میں ایک موٹر کے رُکنے کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا جیپ آگئی پولیس کی۔ لیکن میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُسی طرح لیٹا رہا۔

موٹر کے پٹ بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ پھر وہ قدم میرے قریب آکر رُک گئے۔ مگر میں اُسی طرح آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔

پھر میرے کانوں میں آواز آئی "کیم جی! کہیں سے ایک اوپن ٹرک لاؤ!"

اُس کا کیا کرے گا رستم سیٹھ؟ دوسری آواز نے پوچھا۔

"ہم اس گدھے کو لاد کے اصطبل میں لے جائے گا!"

کاہے کو سیٹھ؟

تم اس وقت جاستی بات مت کرو۔ ہمارا کھوٹی مت کرو۔ رستم سیٹھ نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔ ابھی پولیس والا اِدھر آتا ہوگا۔ اُن لوک کے آنے سے پہلے ہم اس کو اپنے اصطبل میں لے جانا مانگتا۔

بہت اچھا سیٹھ۔ ابھی لاتا ہوں۔ دوسری آواز نے انکساری سے کہا

اور پھر قدموں کی چاپ دُور ہوتی گئی۔ غالباً گیم جی ٹرک کرنے گیا تھا۔ اب
مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا۔ کہ جو کوئی بھی یہ لوگ تھے۔ پولیس والے ہرگز نہ تھے
اس لیے میں نے بے خطر ہو کر اپنی آنکھیں کھولیں۔

میں نے دیکھا۔ کہ ایک سُرخ چہرے والا۔ لمبی مُڑی ہوئی ناک والا گنجے
سر اور سپید بالوں کی کنپٹیوں والا ایک دراز قد بادشاہ ہے۔ جو میرے
اوپر جھکا ہُوا ہے۔ اور مجھے شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے!

بعد میں مجھے رستم سیٹھ نے بتایا کہ میں اُن کے اصطبل میں مسلسل تین چار
دن جانکنی کی حالت میں پڑا رہا۔ رستم سیٹھ نے میرے علاج کے لیے بہترین
سلوتری ڈاکٹر بلوائے۔ جو جانوروں کا علاج کرنے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔
مگر چونکہ یہ سب کے سب ہندوستانی تھے۔ اس لیے ٹھیک طرح سے میرا علاج
نہ کر سکے۔ رستم سیٹھ کے خیال میں مجھے ایک ماڈرن ایکسپرٹ کی ضرورت تھی۔
جو صحیح طریقے سے میرے مرض کی تشخیص کر کے میرا علاج کر سکے۔ بدقسمتی یہ تھی

کہ بمبئی میں اس وقت کوئی ایسا ڈاکٹر موجود نہ تھا جس نے اپنی زندگی گدھوں کے علاج میں گذاری ہو۔ کیونکہ بے چارے گدھے فیس نہیں دے سکتے۔ اور بمبئی میں جتنے ڈاکٹر ہیں سب فیس لیتے ہیں۔

مگر رستم سیٹھ کے ہاں فیس کی کمی کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا مسئلہ گدھوں کے علاج کے تجربے کا تھا بہت دوڑ دھوپ کے بعد معلوم ہوا کہ ہانگ کانگ میں ایک انگریز ڈاکٹر میکینلے رہتے ہیں جو گدھوں کے علاج کے ماہر سمجھے جاتے ہیں ادھر چونکہ انگریزوں کو گذشتہ دو سو سال سے ایشیائی گدھوں کے امراض کا تجربہ رہا ہے۔ اس لیے رستم سیٹھ نے بذریعہ ہوائی جہاز اُسے فوراً میرے علاج کے لیے بلا لیا۔ اور اُنھوں نے آتے ہی میرے مرض کی صحیح تشخیص کر کے فوراً میرا علاج شروع کر دیا۔

یہ تمام اُمور مجھے بعد میں معلوم ہوئے۔ اُس وقت مجھے اتنا یاد ہے کہ تین چار دن کی بے ہوشی کے بعد جب مَیں نے آنکھیں کھولیں تو مَیں نے اپنے آپ کو لکڑی کی ایک بڑی مسہری پر لیٹا ہوا پایا میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ میرے سر کے پیچھے بڑے بڑے آرام دہ ربڑ فوم کے تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ایک نرس میرے بائیں طرف کھڑی تھی۔ دائیں طرف ڈاکٹر میکینلے بڑے غور سے کاغذ کی چند ٹکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ رستم سیٹھ میرے پاس

کھڑے تھے۔ اور بڑی محبت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے آنکھیں کھول کر پوچھا "میں کہاں ہوں؟"

"میرے اصطبل میں!" رستم سیٹھ بڑے پیار سے بولے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"تمھاری رگوں میں خون ڈالا جا رہا ہے۔"

"بولو نہیں" ڈاکٹر میکنلے اپنے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولے "آرام کرو!"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرے جسم کے رگ و پے میں ایک جان بخش توانائی کی رَو دوڑ رہی ہے، دھیرے دھیرے مجھ میں طاقت واپس آ رہی ہے۔ ہولے ہولے ایک سکون دہ ملائم ریشمیں غنودگی مجھ پر چھا رہی ہے۔ اور میں آنکھیں بند کرتے ہی سو گیا۔

پتہ نہیں کتنے عرصے کے بعد میں جاگا۔ لیکن جب جاگا۔ تو دیکھا کہ رات کا وقت ہے۔ میری مسہری کے پاس ایک نیلگوں شیڈ کا ٹیبل لیمپ روشن ہے اور اس کے قریب ایک آرام کرسی پر ماریا بیٹھی ہے!

ماریا؟ —— تم؟ —— یہاں کہاں؟ —— مارے خوشی اور حیرت کے میرے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

ماریا کی بڑی بڑی بریان آنکھوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے گھبرا سا دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی "تمھیں رستم سیٹھ نے خرید لیا ہے۔ جوزف تمھیں لینے کے لیے آیا تھا مگر رستم سیٹھ نے اسے پانچ ہزار روپے دے کر تمھیں اُس سے خرید لیا ہے۔ اور مجھے تمھاری دیکھ بھال کے لیے نرس مقرر کر دیا ہے دو اور نرسیں بھی ہیں۔ ہم تینوں باری باری ڈیوٹی دیتی ہیں۔ کہو کیا حال ہے تمھارا؟ کیسے محسوس کرتے ہو؟"

مگر پانچ ہزار روپے؟ —— ایسی شدید حیرت تھی مجھے کہ میری آواز بیٹھ سی گئی۔ پانچ ہزار روپے! ذرا سوچو تو ماریا۔ ہندوستان میں کسی گدھے کی اتنی قیمت نہ پڑی ہو گی۔

ہاں۔ ماریا نے اقرار کیا۔ ورنہ یہاں جتنے گدھے ہیں۔ روزانہ چند آنوں کی اُجرت پاتے ہیں۔ اور بڑی مشکل سے دن میں ایک بار گھاس کھاتے ہیں۔ تمھاری قسمت تو واقعی اپنی قسم کا ایک ریکارڈ ہے! حالانکہ مسئلہ ہے کہ تمھاری نسل بھی اچھی نہیں!

ایک غریب گدھے کی نسل کہاں اچھی ہو سکتی ہے! میں نے عاجزی سے کہا آج کل اچھی نسل تو ایک اچھی نسل کی گاڑی دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک کیڈلی لیک یا رولز رائیز۔ پیدل چلنے والے گدھے کی کیا نسل اور کیا

اُس کا خاندان؟ ـــــ اسی لیے تو میں تعجب کر رہا ہوں۔ کہ رستم سیٹھ نے مجھے پانچ ہزار روپیوں کے عوض کیوں خرید لیا؟

ماریانے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کئی بار گھمائیں۔ اپنے نازک کندھے اچکائے اور بولی۔ کیا معلوم؟ مگر یہ مجھے معلوم ہے۔ کہ اُنھوں نے تمھارے علاج پر اب تک ہزاروں روپے خرچ کر دیئے ہیں۔ مجھے تو رستم سیٹھ نہایت شریف انسان معلوم ہوتا ہے۔ اُنھوں نے تمھیں خواب میں میرا نام دوبار بڑبڑاتے ہوئے سُنا۔ اور فوراً مجھے معقول تنخواہ دے کر نرس کے کام کے لیے نوکر رکھ لیا۔

ماریا یہ کہتے کہتے کچھ شرماسی گئی۔ میں نے بھی اُس کے نازک جذبات کا احترام کرتے ہوئے مُنہ پھیر لیا۔ اور گلوگیر لہجے میں آہستہ سے بولا۔ رستم سیٹھ میرا محسن ہے۔ اُس نے میری جان بچائی ہے۔ وہ ایک شریف انسان ہے۔ اُس کے دل میں انسانیت کا درد معلوم ہوتا ہے۔ غریبوں کے لیے ہمدردی۔ اور گرے ہوؤں کے لیے شفقت۔ میں تا قیامت ایسے آدمی کا احسان نہیں بھول سکتا!

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ممکن ہے میں کچھ اور بھی کہتا۔ مگر اتنے میں ڈاکٹر میکنلے تشریف لے آئے۔ اور انھیں دیکھتے ہی ماریا اُٹھ

کھڑی ہوئی۔ اور ڈاکٹر کا اشارہ پا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں تو اس کی کمر کے لچکدار خم کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

اب کیسے ہو؟ ڈاکٹر میکنلے نے میری نبض ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں ڈاکٹر! تھینک یو ڈاکٹر!

ڈاکٹر میکنلے مسکرائے۔ انھوں نے نبض دیکھنا چھوڑ دی۔ اور اپنی آرام کرسی میری مسہری کے قریب گھسیٹتے ہوئے بولے۔

"تمہیں دراصل رستم سیٹھ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ گر وہ مجھے بروقت نہ بلاتے تو تمہاری جان کا بچنا محال تھا۔

مجھے کیا بیماری تھی ڈاکٹر؟

OVER EATING زیادہ کھانا!

حالانکہ میری بیماری زیادہ پینے سے ہوئی ہوگی ڈاکٹر! میں نے کہا۔

ایک ہی بات ہے زیادہ کھانا زیادہ پینا ایک ہی مد میں آتے ہیں۔

مگر مجھے یاد ہے! میں نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس دن تو میں نے گھاس کا ایک تنکا تک نہ توڑا۔ اور اس سے پہلے ہی دو دن بارہ بارہ گھنٹے کے لیے مجھے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ آج تک تو مجھے یاد نہیں۔ کہ چند خوش آئند ایام کو چھوڑ کر مجھے کبھی پیٹ بھر کھانا

ملا ہو۔

اسی لیے تو جب تمھیں پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے تو تم زیادہ کھا جاتے ہو۔ اور بیمار پڑ جاتے ہو۔ میں نے اکثر گدھوں میں یہی بیماری دیکھی ہے۔

یہ تو کوئی بیماری نہیں ہے ڈاکٹر۔ میں نے احتجاجاً کہا۔ اصل مرض تو بھوک ہے جس سے سب گدھے مرتے ہیں !

بھوک کا ہم علاج نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ بھوک ایک لاعلاج مرض ہے !

اور بیکاری ؟

بیکاری بھی لاعلاج ہے ۔

اور جہالت ؟

جہالت بھی لاعلاج ہے۔ بلکہ خطرناک ہے ڈاکٹر نے کہا۔ جہاں جہاں گدھوں کو تعلیم دی گئی ہے حکومتیں اُلٹ گئی ہیں !

میں چپ ہو گیا۔ میں نے سوچا۔ ڈاکٹر سے اُلجھنا فضول ہے۔ ممکن ہے علاج ہی کرنا بند کر دے اور واپس ہانگ کانگ چلا جائے۔ لہٰذا میں نے بات پلٹتے ہوئے کہا "تو آپ کے خیال میں میری بیماری زیادہ گھاس کھا جانے سے ہوئی ہے ؟"

بلاشبہ۔

مَیں نے دل میں کہا "ڈاکٹر صاحب کہیں آپ ہی تو گھاس نہیں کھا گئے ہیں" مگر میں دل پر جبر کرکے چپ رہا۔

ڈاکٹر میکنلے بولے۔ تم ایک پڑھے لکھے گدھے ہو۔ میں نے اخباروں میں تمہارا حال پڑھا تھا۔ اسی لیے تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارا مرض بہت خطرناک تھا۔ ایک تو زیادہ کھا جانے کی بیماری۔ اُدپر سے خون خراب تھا!

خون خراب تھا؟

ہاں۔ جو گدھا پڑھ لکھ جائے۔ اُس کا خون اکثر خراب ہو جاتا ہے۔ دماغ بھی خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے مَیں نے آتے ہی تمہارے پیشاب، پاخانے، خون تھوک اور پسینے کا معائنہ کیا۔

پسینے کا بھی معائنہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب؟

ہاں پھر دل دماغ پھیپھڑے۔ جگر گُردے پتّے معدے کا ایکس رے کیا۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچ گیا۔ کہ پڑھنے لکھنے سے تمہارا خون بہت خراب ہو چکا ہے۔ اس لیے جب تک تمہارے جسم میں کسی اَن پڑھ گدھے کا خون داخل نہیں کیا جائے گا۔ تم ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ رستم سیٹھ کا خیال تھا۔ کہ بمبئی میں کسی اَن پڑھ گدھے کا ملنا محال ہے۔ مگر جب اشتہار دیا گیا۔ تو ہزاروں گدھوں کی درخواستیں

موصول ہوئیں۔ جو دس روپے سے گھاس کے ایک گٹھے تک کے لیے اپنا خون بیچنے کے لیے تیار تھے۔ رستم سلیمر کو بڑی حیرت ہوئی۔

" اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ غریبوں نے آج تک اپنا خون ہی بیچا ہے!

ڈاکٹر کے رخسار میری بات سن کر سُرخ ہوتے ہوتے قرمزی شہابی ہو گئے وہ ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا " معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا دماغ ابھی تک بیمار ہے۔ ابھی تمہیں مزید خون کی ضرورت ہے۔ ابھی تمہیں مزید ایک ہفتے تک ان پڑھ گدھوں کا خون دیا جائے گا۔ اور پرانا خون نکال لیا جائیگا۔ اور ایک ہفتے تک میں سمجھتا ہوں۔ تمہارے جسم میں پرانے خون کا ایک قطرہ تک نہ رہیگا!

کیوں میری اُمیدوں کا خون کرتے ہو! ڈاکٹر!!

ڈاکٹر ہنس پڑا۔ بولا۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم آرام کرو۔ رات زیادہ جا چکی ہے۔

دس بارہ دن کے بعد میں بالکل اچھا ہو گیا۔ اور اصطبل کے باہر میدان میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اور دوڑ لگانے لگا۔ ڈاکٹر مسکنلے بھی اپنی بیش بہا فیس لیکر واپس ہانگ کانگ چلا گیا۔ ماریا البتہ ابھی تک میری دیکھ بھال کے لیے مامور تھی۔ حالانکہ دوسری دو نرسوں کو چھٹی کر دی گئی تھی۔ چہل قدمی کرتے وقت اکثر ماریا

میرے ساتھ ہوئی تھی۔ اور اپنی دلکش باتوں سے میرا دل لبھاتی تھی۔

پھر ایک روز رستم سیٹھ میرے پاس آیا۔ اُس کے ساتھ ایک حجام بھی تھا۔

رستم سیٹھ نے میری طرف اشارہ کرکے حجام سے کہا۔ اس کے جسم کے سارے بال مونڈ ڈالو۔ اور اس کے جسم کو ایک گھوڑے کے جسم کی طرح شفاف و چکنا بنا دو!

حجام نے کہا۔ میں کانپور کا نائی ہوں میں نے آج تک صرف انسانوں کے سر گھوٹے ہیں۔

تو ایک گدھے کو مونڈ دینے میں کیا ہرج ہے؟ رستم سیٹھ نے پوچھا۔

ناں صاحب! حجام انکار کرتے ہوئے بولا۔ میں کان پور کا نائی ہوں۔ اگر اُن لوگوں کو پتہ چل گیا۔ کہ میں نے ایک انسان کی بجائے ایک گدھے کو مونڈ دیا ہے تو مجھے جات باہر کر دیں گے!

اُنھیں بالکل پتہ نہیں چلے گا! رستم سیٹھ بولا۔ اس کی میں گارنٹی لیتا ہوں۔

حجام نے اپنی بھینگی آنکھ سے مجھے سر سے پاؤں تلک دیکھا۔ میں ایک آدمی کے سر گھوٹنے کے دو روپے لیتا ہوں۔ یہ تو گدھے کا پورا جسم ہے! میرا اُسترا بیکار ہو جائے گا۔ میری بال کاٹنے کی مشین بھی خراب ہو جائے گی۔ پھر مجھے گنگا سنان بھی کرنا پڑے گا۔ ناں صاحب میں ایسا نیچ کام نہیں کروں گا۔ میں کانپور کا نائی ہوں۔

جب حجام واپس چلنے لگا تو رستم سیٹھ نے اُس کے ہاتھ میں سو کا ایک نوٹ تھمایا۔ اور بولا۔ اب کرے گا ؟

" ایسے کیوں نہیں کرے گا سیٹھ " حجام فوراً بولا۔ اپنا کام تو بال کاٹنا ہے چاہے آدمی ہو یا گدھا۔۔۔۔ اب کہو تو اس کی چٹیا بھی رکھ دوں ؟

نہیں۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے ! رستم سیٹھ گھبرا کر بولا۔ اس گدھے کا کوئی مذہب نہیں ہے !

حجامت کے بعد مجھے صابن اور گرم پانی سے کئی بار نہلایا گیا۔ خشک تولیوں سے میرا جسم کئی بار رگڑا گیا۔ پھر کئی دن تک میرے جسم پر زیتون کے تیل کی مالش ہوتی رہی۔ اور آخر میں ایک عجیب وغریب پالش میرے جسم پر کیا گیا جس سے میرا جسم سر سے پاؤں تک ایک مُشکی گھوڑے کی کھال کی طرح چمکنے لگا۔ ساری زندگی میں میں نے اپنے آپ کو کبھی ایسا خوب صورت نہ پایا تھا۔ اب تو کبھی کبھی ماریا بھی دزدیدہ نگاہوں سے میری جانب تعریفی انداز سے دیکھ لیتی تھی۔

میں نے ماریا سے کہا سیٹھ رستم ایسا فرشتہ خصلت دیوتا سروپ انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیسی بے غرض ہمدرد طبیعت پائی ہے اس نے۔ میرے اپنے سگے رشتہ دار ایسا سلوک نہیں کرتے ہیں۔ جو اس نے مجھ سے کیا ہے۔

اسے دیکھ کر میرے ایسا گدھا بھی انسانیت پر ایمان لا سکتا ہے !

ماریا نے کہا۔ خدا تمہارے اور میرے محسن کو تا ابد زندہ رکھے۔

اس گفتگو کے دوسرے دن ایک گھنی مونچھوں والا سانولے رنگ کا دوہرے بدن کا ادھیڑ عمر کا آدمی جس کی نگاہیں میرے بدن کو برمے کی طرح چھیدتی تھیں ایک ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ سیٹھ رستم اور حکیم جی بھی ساتھ ہی تھے۔

ڈاکٹر نے میرا اچھی طرح سے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ یہ تو مجھے گدھا معلوم ہوتا ہے۔ !

رستم سیٹھ نے کہا۔ اجی نہیں۔ یہ پیرو (PERU) کا گھوڑا ہے۔ پیرو ریاست جنوبی امریکہ میں واقع ہے۔ وہاں کے گھوڑے بالکل گدھوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔

" اور بونا بھی ہے "! گھنی مونچھوں والے آدمی نے اعتراض کیا۔

وہاں کے گھوڑے اسی طرح کے بونے ہوتے ہیں "! حکیم جی بولا۔ سیٹھ نے اسے خاص طور پر پیرو سے منگایا ہے۔ ہندوستان میں آج تک اس نسل کا گھوڑا کبھی نہیں آیا۔ یہ مخلوط النسل گھوڑا ہے۔ باپ ہسپانوی۔ ماں ساؤتھ امریکہ کی انڈین۔ دونوں کی کراس بریڈنگ سے یہ نسل تیار ہوئی ہے ! دوڑنے میں بے حد تیز ہوتی ہے !

ہونہہ ؟ گھنی مونچھوں والے آدمی نے مشتبہ انداز سے سر ہلایا۔ پھر بولا۔ اس کا نام کیا ہے ؟

گولڈن سٹار ! رستم سیٹھ بولا۔

ہونہہ ؟ اب کے ڈاکٹر نے مشتبہ انداز میں سر ہلایا۔

پھر رستم سیٹھ گھنی مونچھوں والے آدمی اور ڈاکٹر کو ایک طرف لے گیا۔ دونوں میں دیر تک کچھ کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اس کے بعد وہ دونوں۔ ڈاکٹر اور گھنی مونچھوں والا آدمی چلے گئے۔ اور سیٹھ رستم جی کونے کر خوشی سے مسکراتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور بولا۔

سب طے ہو گیا۔ کل سے تم کو مہالکشمی کے ریس کورس کے اصطبل میں منتقل کر دیا جائے گا۔

مہالکشمی کے ریس کورس میں کیوں ؟

وہاں ایک ماہ بعد تمہیں کرسمس کپ والی ریس کورس کے مقابلے میں شامل کیا جائے گا۔

میں ! ایک گدھا ہو کر گھوڑوں کی ریس کورس میں شامل ہونگا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ آپ لوگوں کی عقل تو سلامت ہے ؟ آج تک کبھی کوئی گدھا کسی گھوڑے سے تیز دوڑا ہے ؟

رستم سیٹھ نے مسکرا کر کہا۔ تمہاری دوڑ کا تو ہم نے اُسی دن اندازہ کر لیا تھا جس دن پولیس والوں نے تمہارا پیچھا کیا تھا۔ اور تم پولیس کی جیپ اور دوسری تیز رفتار گاڑیوں سے بھی تیز بھاگتے ہوئے ماہم سے دالی سی بیچ تک چلے آئے تھے۔ میں اور کیم جی اپنی چھوٹی سبز کار میں تمہارے پیچھے پیچھے تمہارا تعاقب کرتے رہے۔ اور میں نے تمہاری رفتار کا اُسی دن اندازہ کر لیا تھا۔ اگر تم اُسی رفتار کی تین چوتھائی رفتار پر بھی ریس میں دوڑو۔ تو بھی تم سب گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ جاؤ گے!

میں نے حیرت سے کہا سیٹھ جس دن تم نے میری جان بچائی تھی کیا اُسی دن تم نے اس کا اندازہ کر لیا تھا؟

سیٹھ ہنس کر بولا۔ اندازہ میں نے پہلے کر لیا تھا۔ جان بعد میں بچائی تھی۔

تو یہ بات تھی!

اِس لیے سیٹھ نے میری جان بچائی تھی!!

میں ایک گدھا۔ گھوڑوں کی ریس میں سمگل کیا جاؤں گا؟ اسے مار دیا ذرا سوچو تو یہ سمگلنگ کہاں کہاں نہیں ہے۔ میں نے کچھ اُداس اور پریشان

ہو کر ماریا سے کہا۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ میں ریس میں حصّہ لوں!

سیٹھ نے تمہاری جان بچائی ہے۔ اُس نے تمہارے علاج پر ہزاروں روپے صرف کئے ہیں۔ ماریا نے سوال کیا۔ کیا اتنے بڑے محسن کا تم پر کوئی حق نہیں ہے؟ کیا تم اُس کے احسان کا بدلہ نہ چکاؤ گے؟

مگر اس کا کیا بھروسہ ہے کہ میں ہی ضرور یہ ایسی جیت جاؤں گا!

جس سپیڈ کی سیٹھ بات کرتے ہیں۔ اُس وقت کی بات کچھ اور تھی اُس وقت میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اُس وقت تو ایک گدھا بھی ایک گھوڑے سے تیز بھاگ سکتا ہے ...... نہیں ماریا میں اس ریس میں حصّہ نہ لوں گا!

اچھی طرح غور کرو۔ ماریا بولی۔ تاریخ میں ایسا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا جب ایک گدھے نے گھوڑوں کی ریس میں شرکت کی ہو۔ تم پہلے گدھے ہو گے اپنی قوم کے پہلے نمائندے!!

ایسا مت کہو میں نے پوچھا۔ اور وہ سب لوگ کیا ہیں۔ جو ریس کورس کی اندرونی سازشوں اور پیچیدگیوں سے ناواقف ریس کورس کے ہر گھیرے میں ہزاروں کی تعداد میں شامل ہو کر گاڑھی کمائی کے لاکھوں روپے ایک داؤ پر لٹا دیتے ہیں؟ اُن کو تم کیا کہو گی؟

ماریا۔ سیٹھ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ کامیاب بزنس کا سدارا راز اسی میں ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہاں تک گدھا بنا سکتا ہے !

میں ایسا کام کیوں کروں ؟ میں نے کہا۔ جس سے عام لوگوں کے لاکھوں روپے کا نقصان ہو !

تم اگر اس ریس میں شامل نہیں ہو گے۔ تو بھی کیا فرق پڑیگا۔ ریس تو لوگ پھر بھی کھیلیں گے۔ ہاں اتنا ضرور ہوگا کہ ماریا بے چاری کی روزی ختم ہو جائے گی۔ ماریا نے آہستہ سے کہا۔

تمہاری روزی بھی ؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

تو تم کیا سمجھتے ہو سیٹھ نے مجھے اب تک کیوں نوکر رکھا ہے ؟ ماریا میری گردن پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔ ڈیئر ڈنکی ! کیا تم میری خاطر اس ریس میں حصہ نہیں لے سکتے۔ ؟

تمہارے لیے تو اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اگر تمہارا معاملہ بیچ میں ہے۔ تو سمجھ لو یہ گدھا اس ریس میں ضرور دوڑے گا نہ صرف دوڑے گا۔ بلکہ ریس جیتنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔

" ڈارلنگ " ! ——— ماریا نے خوش ہو کر میری گردن پہ ایک بوسہ ثبت کیا " مجھے تم سے یہی اُمید تھی "

مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی مجھ سے اس قدر پیار کرتی ہو میں نے
کسی قدر شرماتے ہوئے کہا۔ آخر تو میں ایک گدھا ہوں!
عشق کرنے کے لیے کسی حد تک گدھا ہونا لازمی ہے! ماریا نے شوخ
لہجے میں جواب دیا۔ پھر وہ اپنی کمر کے زہریلے خم دکھاتی ہوئی اصطبل سے باہر
چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے مسرت سے ایک زوردار دولتی جھاڑی
اور اصطبل کے دروازے سے سر نکال کر درباری بلمپت میں ایک ایسی تان
لگائی جس نے سارے اصطبل کو گونجا دیا۔
ماریا اصطبل سے نکل کر لان پر سے گزرتی ہوئی سیٹھ کے بنگلے کی طرف
جا رہی تھی۔
سمندر کی ہوائیں اجنبی دیس کی خوشبوئیں لا رہی تھیں۔ دور اوپر پیاز
دوز کا چاند ایک گدھی کے سُم کی طرح شفاف تھا۔ اور آسمان کی گھاس پر
ہر جگہ ستارے باجرے کے دانوں کی طرح چمک رہے تھے!
دیس سے چند روز پہلے گھوڑ دوڑ کے متعلق اخباری کالموں میں رستم جی
کے نئے گھوڑے گولڈن شلر کا ذکر تھا۔ اس کے شجرہ نسب کا ذکر تھا جو نیم پیچ
نیم نیٹو بنایا گیا تھا۔ بیشتر کالم نگار اس گھوڑے کے متعلق کوئی اچھی رائے
رکھتے تھے۔ اور انھوں نے اپنے پڑھنے والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس

تجربہ کار گھوڑے پر اپنا روپیہ ضائع نہ کریں!

ماریا اخباروں سے پڑھ کر یہ تذکرے سناتی رہی۔ اور میں انھیں سن سن کر
اخوں لکھو لتا رہا۔ اور میں نے تہیہ کر لیا کہ ریس کے روز میں اس طرح
دوڑوں گا جیسے میرے پیچھے بمبئی کی ساری پولیس فورس تعاقب کر رہی ہو
ان کالم نگاروں کو دکھا دوں گا کہ اگر ایک گدھا چاہے تو اونچی سے
اونچی نسل کے گھوڑوں کو مات دے سکتا ہے۔ ٹانگوں میں طاقت ہو اور
دل میں عشق راسخ ہو تو کیا نہیں ہو سکتا؟

پھر ریس کا دن آگیا۔ مجھے کچھ عرصہ پہلے مہالکشمی کے اصطبل میں منتقل کر دیا
گیا تھا۔ مگر افشائے راز کے پیش نظر مجھے دوسرے گھوڑوں سے الگ رکھا گیا
تھا۔ اور کسی فوٹو گرافر کو میرا فوٹو لینے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ ریس سے ایک
ہفتہ قبل ماریا نے مجھے ڈٹ کر کھرا بلایا۔ اور ایک ڈاکٹر نے مجھے ایک
انجکشن دیا۔ اور میرے جسم و جان میں تیرگی سی سنسناہٹ محسوس ہونے لگی!

ریس کورس کے سٹینڈ ہزاروں کھلاڑیوں سے بھرے ہوئے تھے جب
لوگوں نے مجھے دیکھا تو مارے حیرت کے ان لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اور
تماشائیوں کے گروہ کے گروہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔ وہ سب لوگ مجھ پر ہنسنے
لگے۔

مارے غصے کے میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ میں نے دانت پیسے مگر خاموش رہا۔ اونر زگیلری میں ماریا سیٹھ رستم کے قریب کھڑی تھی۔ اور اپنا گلابی رومال ہلا ہلا کر مجھے جرأت دلا رہی تھی۔ تماشائیوں کے رد عمل سے میں کس قدر آزردہ ہو گیا تھا۔ مگر ماریا کو دیکھتے ہی میرا دل عزم اور قوت سے معمور ہو گیا۔ اور میں ریس کے گھوڑوں کی قطار میں سب سے آخر میں کھڑا ہو گیا۔ ریس شروع ہوتے وقت بھی سب سے آخر میں تھا۔

ریس کے پہلے چکر میں بھی میں سب سے آخر میں تھا۔ جدھر جدھر سے میں گزرتا گیا۔ تماشائی مجھ پر ہنسنے لگے۔

اب یہ گدھا ہے گدھا! اس ہسپانوی گھوڑے سے تو گدھے بھی تیز دوڑتے ہوں گے۔

کسی تماشائی نے مجھ پر ایک روپیہ لگانے کی ہمت نہ کی تھی۔ ماریا کا چہرہ فق تھا۔ اور رستم سیٹھ کا چہرہ زرد تھا۔

ماریا کے چہرے کو دیکھ کر میرے دل میں جوش اور ولولے کی ایک لہر اُٹھی اور میں نے دانت پیس کر ایسی زقند بھری کہ آدھے فرلانگ میں تین گھوڑوں سے آگے نکل گیا۔ پھر چوتھے گھوڑے سے۔ پھر پانچویں گھوڑے سے پھر چھٹے گھوڑے سے۔ پھر ساتویں گھوڑے سے۔

بک اپ گولڈن سٹار! ماریا خوشی اور حسرت سے چلائی۔ سامنے سٹینڈ میں صرف اُس کی آواز گونجی۔ کیونکہ اور کسی تماشائی نے مجھ پر داؤ نہ لگایا تھا سب حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔ اب میرے آگے صرف دو گھوڑے تھے اور وِننگ پوسٹ صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

"بک اپ صبح کا تارا!" ہزاروں تماشائی "صبح کے تارے" کے لیے چلانے لگے جو سب سے آگے تھا۔ اور جس پر ہزاروں تماشائیوں نے داؤ لگایا تھا۔

"بک اپ ماہ پارا!" دوسرے تماشائیوں نے ماہ پارا کے حق میں پکارا۔ کیونکہ انھوں نے ماہ پارا پر داؤ لگایا تھا۔ جو اس وقت نمبر دو تھا۔

بک اپ مائی ڈارلنگ گولڈن سٹار! ماریا زور سے چلائی۔ اور اُس کی آواز سنتے ہی میں آنکھیں بند کر کے جسم و روح کی پوری قوت سے دوڑا اور ایک تیر کی طرح سنسناتا ہوا دونوں گھوڑوں کو پاس گزرتے پیچھے چھوڑتا ہوا وِننگ پوسٹ سے آگے نکل گیا!

بمبئی ریس کورس کی تاریخ میں ایسا واقعہ کبھی نہ ہوا تھا۔ گولڈن سٹار نے ایک سے نوے کا بھاؤ دیا تھا۔ صرف سات ٹکٹ گولڈن سٹار پر لگائے گئے تھے۔ جو سب کے سب رستم سیٹھ کے اپنے آدمیوں نے خریدے تھے۔

ماریا نے مجھ پر دو سو روپے لگائے تھے۔ آسے اٹھارہ ہزار ملے۔
رستم سیٹھ نے مختلف بکتیوں کے ہاں بھاری رقمیں لگائی تھیں۔ کچھ
دوسرے گھوڑوں پر بھی داؤ لگائے تھے۔ ہار جیت کا سب کٹ کٹا کے
اُس نے جو اندازہ کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس نے گولڈن سٹار پر داؤ لگانے
میں کوئی غلطی نہیں کی۔ دو بکتی ضرور دیوالیہ ہو گئے۔ مگر سیٹھ نے اڑھائی لاکھ
روپیہ ایک ریس سے سمیٹ لیا۔
گولڈن سٹار!

ریس ختم ہونے کے بعد مجھے چند گھنٹوں میں ہما لکشمی کے اصطبل سے سیٹھ کے اصطبل میں منتقل کر دیا گیا۔ سیٹھ نے خوب میری پیٹھ ٹھونکی ماریا نے مجھے پیار کیا۔ حکیم جی نے جو میرا حاجی تھا۔ مجھے گردن پر کئی بار تھپتھپایا اور میری درخواست پر رستم سیٹھ نے وعدہ کر لیا۔ کہ ڈاکٹر رام اوتار کو میرے حساب میں دو ہزار روپے بھیج دیں گے۔ کیونکہ سیٹھ سے پہلے رام اوتار نے میری جان بچائی تھی۔ اور اس کا بل مجھ پر باقی تھا۔

رات کو ماریا نے مجھے اپنے ہاتھ سے کیوڑے کی خوشبو میں معطر ہری

ہری گھاس کھلائی۔ اور مجھے اصلی سکاچ وہسکی پہلی بار چکھنے کو ملی۔ میں عالم سرخوشی میں دو بوتلیں ختم کر گیا۔ سکاچ پینے ہی مجھے گہری نیند آگئی۔ اور میں چوبی مسہری پر لمبی تان لے کر سو گیا۔

آدھی رات کے وقت یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ میرے اصطبل کے باہر کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ میں نے چوبی دیوار سے کان لگا دیئے۔ سیٹھ کی آواز آئی۔ اس معاملے کی گہری تفتیش ہوگی۔ دوسری ریس کا رسک لینا ٹھیک نہ ہوگا۔

کھیم جی جاکی بولا۔ مگر سیٹھ گولڈن سٹار نے تو کمال ہی کر دیا آج!

تم نہیں سمجھتے ہو۔ سیٹھ بولا۔ ہم رسک نہیں لے سکتے۔ جب تفتیش شروع ہوگی۔ تو بالآخر یہ ضرور پتہ چل جائے گا۔ کہ ہم نے ایک گدھے کو گھوڑا دیا کی ریس میں شامل کیا ہے۔ اس حالت میں نہ صرف میرے اصطبل کو ریس کورس سے خارج کر دیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے مجھے جیل بھی ہو جائے۔ دھوکہ دہی کے سلسلے میں۔ میں رسک نہیں لے سکتا۔ گولڈن سٹار کو ختم کر دینا ہوگا۔

وہ کیسے؟ کھیم جی جاکی نے پوچھا۔

تو اسے کسی بہانے سے یہاں سے نکال کر سمندر کے کنارے لے جاؤ۔ مگر یہ گدھا ہے بڑا کایاں۔ اسے شبہ نہ ہونا چاہیئے۔ اس سے کہہ دو کہ

یہاں پر تمھاری جان کے لیے خطرہ ہے - یہاں سے نکال کے اسے سمندر کے کنارے لے جاؤ - اور پستول سے اسے ہلاک کر کے سمندر میں اس کی لاش کو دھکیل دو - کیوں ماریا؟

ہاں یہ ٹھیک ہے! ماریا کی آواز آئی - نہ گدھے کی لاش ملے گی - نہ تفتیش کسی نتیجے پر پہنچ سکے گی - !

پہلے تو میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ ماریا کی بات سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے - تو یہ ہے میری محبت کا انجام!

کیم جی جا کی بولا - کچھ اچھا نہیں لگتا سیٹھ - جس جانور سے ہم نے لاکھوں روپے ایک ہی داؤ میں کما لیے ہوں - اُسے اس طرح ختم کر دینا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا -

احمق نہ بنو! سیٹھ نے تحکمانہ لہجے میں کہا - جب کسی گدھے سے مزید کسی فیض کی توقع نہ ہو - اُسے ختم کر دینا ہی اچھا ہے!

پھر کھسر پھسر بند ہو گئی - پھر بہت دیر تک سناٹا رہا - اور رات کی خاموشی ایک خنجر بن کر میرے سینے پر لٹکتی رہی - اور میں سوچنے لگا - مجھے یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہیئے - مگر کس طرح؟ اصطبل کا دروازہ باہر سے بند تھا - اور

ایک گدھا روشندان سے نہیں بھاگ سکتا۔

کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے نا اُمیدی کے عالم میں اپنے آپ کو پکارا۔ موت میرے سر پر کھڑی ہے! پھر ہولے سے اصطبل کا دروازہ کسی نے کھولا۔ اور ایک تاریک سایہ اندر داخل ہُوا۔

میں نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کون ہے؟

معاً کسی نے دیوار پر ہاتھ پھیر کر سوئچ دبایا۔ اصطبل میں روشنی ہوگئی میرے سامنے حکیم جی کھڑا تھا۔

کیا ہے؟

اُٹھو چلو باہر!

کہاں؟

سمندر کے کنارے!

کیوں؟

ٹہلیں گے۔ تم سے بات کریں گے!

یہاں ہی بات کیوں نہیں ہو سکتی؟ میں نے پوچھا۔

یہاں بہت گرمی ہے۔ اور ممکن ہے کوئی سن لے۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ حکیم جی جا کی بولا۔ سمندر کے کنارے ٹہلیں گے۔ اور تم سے دوسری

ریس کے بارے میں باتیں کریں گے !

میں نے اپنے دل میں کہا یہ تم اب مجھ سے اُس ریس کے متعلق کیا بات کرو گے جو میری موت تک جاتی ہے ! مگر میں چپ رہا۔ کھیم جی نے میری گردن میں رسی باندھی۔ اور مجھے اصطبل سے نکال کر سمندر کے کنارے لے چلا۔

راستے میں اندھیرا تھا۔ ناریل کے پیڑ فوجی سپاہیوں کی طرح اپنے سیاہ تنے رائفلوں کی طرح اٹھائے کھڑے تھے سمندر کی لہریں اک غضب ناک شور کے ساتھ ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ چاروں طرف آدم نہ آدم زاد...

بس ایک گدھا اور ایک آدمی!

ایک قاتل۔

ایک مقتول....

سمندر کے ساحل پر پہنچ کر کھیم جی نے مجھے کھڑا کر دیا۔ اور مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ کر بولا جانتے ہو میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟

ہاں! میں نے اداس لہجے میں کہا۔ تم میری جان لینے کے لیے یہاں مجھے لائے ہو!

کھیم جی نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ اب اپنی موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔

میں بالکل تیار ہوں! مگر میری ایک درخواست ہے!

"کیا؟"

جس آدمی نے پہلی بار خچر پر سوار ہو کر ایک گدھے کو گھوڑوں کی ریس میں جتایا۔ میں مرنے سے پہلے اُس آدمی کے ہاتھ چومنا چاہتا ہوں۔

اس میں کیا ہے۔ حکیم جی نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا "لو چوم لو"۔ ۔ ۔

جونہی اُس نے ہاتھ آگے بڑھائے۔ میں نے پلٹ کر اس زور کی دولتی جھاڑی کہ وہ چکرا کر ساحل کے پتھروں پر گر پڑا۔ اور میں اس موقع کو غنیمت سمجھ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ تھوڑی دیر کے بعد کراہتے ہوئے حکیم جی کی گالیوں کی آواز آئی۔ مگر میں پیچھے دیکھے بغیر سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ اور ریس کورس کی رفتار سے بھی تیز۔ پھر یکایک کئی گولیوں کے چلنے کی آواز آئی۔ اور کئی گولیاں میرے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔

پھر ایک گولی پیچھے سے آئی۔ اور میری پچھلی داہنی ٹانگ کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔

میں چکرا کر گرنے ہی کو تھا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور دوڑتا دوڑتا چلا گیا۔ بازار، سڑک، موڑ، نکڑ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میں اپنی زندگی بچانے

کے لیے بھاگ رہا تھا۔

بہت عرصہ بھاگنے کے بعد جو مَیں نے پیچھے مڑکر دیکھا، تو دُور دُور تک کوئی نہ تھا۔ رات اکیلی تھی۔ سڑک اکیلی تھی۔ آس پاس کے سب بنگلے سوئے ہوئے تھے۔

یکایک اپنے آپ کو اکیلا پا کر میری ٹانگوں نے مجھے جواب دے دیا اور میں ناریل کے ایک پیڑ کے نیچے ایک بنگلے کے دروازے کے باہر گر گیا۔

صبح کو جب بنگلے کے مالی نے مجھے ڈنڈے مار کر بھگانا چاہا۔ تو مجھ سے
اُٹھا نہیں گیا۔ میری ٹانگ سوج گئی تھی۔ اُس کے زخم سے خون بہہ بہہ کر سوکھ گیا تھا
اس لیے میں اس بیکسی کے عالم میں پڑا پڑا مار کھاتا رہا۔ اور درد سے ٹکراتا رہا
میری چیخیں سن کر بنگلے کا مالک باہر نکل آیا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا سا
رنگ کا آدمی تھا جس کے بال کنپٹیوں تک غائب تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی
بڑی اور چمک دار تھیں۔ اور وہ رک رک کر بات کرتا تھا۔ اور الفاظ اُس کے
ہونٹوں سے یوں نکلتے تھے جیسے کسی کشید کرنے والی نلکی سے قطرہ قطرہ کر

بھر رہے ہوں ۔

"کیا بات ــــــ مالی ــــــ یہ کون ہے؟"

گدھا ماسٹر! مالی نے مجھے ڈنڈا مارتے ہوئے کہا۔

ماسٹر نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اپنے گنجے سر پہ ہاتھ پھیرا اپنی ملبوتری ٹھوڑی کھجائی جس پہ فرینچ کٹ داڑھی نمایاں تھی۔ پھر اُس کی آنکھیں ایکدم چمکنے لگیں۔ جیسے کسی عمدہ خیال نے انھیں منوّر کر دیا ہو۔

ہوں! وہ بولا۔ یہ تو زخمی ــــــ اس کو اندر ــــــ فوراً ــــــ لاؤ۔

مالی اس طرح چونکا۔ جیسے اُسے اپنے مالک سے اس ہمدردی کی توقع نہ ہو! وہ زیرِلب کچھ بڑبڑایا۔ پھر رسّی لینے کے لیے اندر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی مالک بھی اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مالی اپنے دو جوان بیٹوں کو لے کر باہر آ گیا۔ وہ لوگ رسّوں سے مجھے گھسیٹ کر اندر لے گئے۔ اور ایک لان پہ لے جا کر چھوڑ دیا۔ پھر اُس کے جوان بیٹے مالی کے کوارٹر میں چلے گئے اور مالی اندر بنگلے کے چلا گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مالک بنگلے کے اندر سے کچھ دوائیں اور پٹیاں لے کر نکلا۔ اُس کے ساتھ ایک ملازم بھی تھا۔ مالک نے میرا زخم

دھر دیا۔ نشتر سے آپریشن کر کے گولی نکالی۔ پٹی کی۔ مجھے ایک انجکشن دینے

اتنے میں بنگلے کے اندر سے سُرخ بالوں والی ایک مغربی حسینہ برآمد ہوئی۔ وہ ماسٹر سے کم سے کم ڈیڑھ فٹ اونچی ہوگی۔ اُس نے تیراکی کا ایک عمدہ بکنی سوٹ پہنا ہُوا تھا۔ یعنی کمر پر ایک پھولدار چڈی۔ اور پستانوں پر ایک رومال نما پھولدار کپڑا۔ بس اُس کا گورا ننگا جسم بے حد متناسب اور حسین تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کا جسم گوشت کی بجائے سونے کی کونوں کا بنا ہُوا ہے۔

ماسٹر؟ وہ حیرت سے چلائی۔ یہ جانور کون ہے؟

جس لہجے میں اُس مغربی عورت نے بات کی۔ اُس سے مجھے فوراً اندازہ ہو گیا۔ کہ یہ عورت انگریز نہیں ہو سکتی۔ گو انگریزی میں بات کہہ تی تھی۔ ہما قریب آ کر بولی۔

یہ تم کیا کر رہے ہو؟

ڈنکی زخمی ——— اس کو میں ——— دیتا انجکشن! ماسٹر بولا۔

میں مجھے معلوم ہُوا۔ کہ بنگلے کے مالک کا نام ایچ بی ماسٹر تھا۔ اور وہ ایک ڈاکٹر اور سائنس دان تھا۔

"وات؟ ددنکی؟ پور دونکی! پُور پُور ددنکی" وہ عورت میرے قر

آہستہ سے جھکی اور میری گردن پر ہاتھ پھیرنے کے لیے اُس نے اپنا شفاف ہاتھ پھیلایا۔

"دُور ہٹ۔ لولا! ماسٹر تحکمانہ لہجے میں ۔۔ وہ لولا گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور خوفزدہ ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر ماسٹر نے مُڑ کر بھی اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ بڑے اطمینان سے اُس نے مجھے دو انجکشن لگائے اور پھر دوائیوں کا بکسا اور خالی سرنجیں نوکر کو دے کر لولا سے بولا۔

"میں کرتم۔ ایسا ڈریس۔ آئیں سامنے ۔۔۔ اجنبی کے! بے شرم!"

"مگر یہ تو ایک گدھا ہے۔ جانور ہے"! لولا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں چلینگا" وہ غصے سے بولا" بدلو اس کو ۔۔۔ اندر جا کر ۔۔۔ فوراً!"

لولا بولی۔ مگر ڈارلنگ۔ میں تو اس کو پہن کر سومنگ پول میں نہانے جا رہی تھی۔

"نو بانہ ۔۔۔ میرا حکم ۔۔۔ ڈریس بدلو!" وہ چھوٹا سا آدمی ایڑیاں اُٹھا کر غصے سے بولا۔

ایک لمحے کے لیے لولا کا چہرہ اس قدر لال ہو گیا۔ کہ اُس کے رخساروں اور اُس کے بالوں کے رنگ میں کوئی فرق نہ رہا۔ اُس کی آنکھیں گہری سبز

ہو گئیں۔ اگر وہ چاہتی تو اُس چھوٹے سے ٹیاں سے آدمی کو دہلا لیسے دیتی کہ وہ وہیں گر جاتا۔ مگر وہ ہونٹ چبا کر خاموشی سے مُڑ گئی اور بنگلے کے اندر چلی گئی۔ ماسٹر مسکرانے لگا۔

"نونخرہ —— تو نخرہ —— ہم ماسٹر!" ماسٹر میری طرف دیکھ کر اس طرح مسکرایا۔ جیسے مجھ سے داد طلب کر رہا ہو۔ بھلا میں کیا کہتا۔ اپنی آنکھیں جھپکائے بغیر دیر تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر کچھ سوچتا ہُوا اندر چلا گیا۔

لان پہ دھوپ پڑنے لگی۔ میرے جسم میں خوشگوار حدّت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ پٹی سے اور انجکشنوں سے مجھے بہت فائدہ محسوس ہو رہا تھا جس کا ایک نتیجہ یہ ہُوا کہ مجھے شدید بھوک محسوس ہونے لگی۔ اتنے میں مالی کے دو بیٹے میرے لیے گھاس لے کر آ گئے اور مجھے کھلانے لگے۔

جب وہ مجھے گھاس کھلا رہے تھے اُس وقت دوسرے لان میں ایک رنگدار چھتری کے نیچے ایک نوکر آ کر ایک غالیچہ بچھا گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بنگلے کے اندر سے لولا اور ماسٹر برآمد ہوئے۔ لولا نے ایک عمدہ مغربی فراک پہن رکھا تھا۔ اور سر پر تولیہ نما ایک ٹوپی پہن رکھی تھی۔ (جو بعد میں تولیہ ہی ثابت ہوئی) اُس کے ہاتھ میں تیل کی دو شیشیاں تھیں۔ اُس کے

ساتھ ماسٹر سیاہی مائل نیکر پہنے ہوئے چل رہا تھا۔ اُس نیکر کے سوا وہ سر سے پاؤں تک ننگا تھا۔ دھوپ میں اُس کا سرمئی بدن یوں چمک رہا تھا جیسے وہ آدمی نہ ہو۔ کسی بھینس کا تازہ تولّد شدہ بچہ ہو۔

وہ نوکرانی چھتری کے نیچے آ کے غالیچے پر اوندھا لیٹ گیا۔ اور لولا تیل سے اُس کی پیٹھ پر مالش کرنے لگی۔ اُن دونوں کو دیکھ کر مالی کے دونوں بیٹے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے

"جونہی مالک کی بیوی جاتی ہے اپنے ملک کو یہ حرامجادی لولا فوراً آ جاتی ہے" ایک بولا۔

دوسرے نے کہا "میں تو حیران ہوں۔ اتنی لمبی چوڑی میم اِس چرینٹے میں کیا دیکھتی ہے؟"

"پیسہ!" پہلا ہنس کر آہستہ سے بولا۔

"پیسہ تو اِس خوبصورت میم کو کہیں بھی مل سکتا ہے"!

"گاڑی"! پہلا بولا۔

نوکروں پر کیسے حکم چلاتی ہے۔ دوسرا بولا۔ جیسے گھر کی مالکن یہی ہو۔ انگریزی میں گالی دیتی ہے"

مجھے کہیں اکیلے میں مل جائے تو ۔۔۔ پہلا اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

اور نہایت لذیذ خیالوں میں کھو گیا۔

ہم کو کیوں ملنے لگی۔؟ مالی کے دوسرے نوجوان بیٹے نے آہ بھر کر کہا۔

ماسٹر کی شکل تو دیکھو! چیلا بے حد بیزاری کے لہجے میں آہستہ سے بولیں

"عورت شکل نہیں دیکھتی راجہ! پیسہ دیکھتی ہے!"

پھر دونوں چپ ہو گئے۔ جیسے ہمیشہ کے لیے اس زندگی سے بیزار ہو چکے ہوں۔ پھر گھاس بھی ختم ہو گئی۔ اور دونوں وہاں سے چلے گئے اور میں اپنے کان کھڑے کر کے دوسرے لان کی گفتگو سننے لگا۔

لولا پوچھ رہی تھی۔ اس گدھے کو رکھ کر کیا کرو گے تم؟

تجربہ! ماسٹر بولا۔

کیسا تجربہ ——؟

سیرم! (SERUM)

کیسا سیرم؟

ناسور —— پرانا زخم —— سب ٹھیک! —— دو دن میں! ماسٹر نے اُسے لیٹے لیٹے سمجھایا۔

مگر مغرب میں تو اس کام کے لیے گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔

سرلا بولی اُنہی کے خون سے سیرم تیار ہوتا ہے۔ اُنہی پر تجربے کئے جاتے ہیں۔

جیسا میں نے سُنا ہے!

گھوڑا مہنگا —— گدھا سستا —— ماسٹر دو ٹوک بولا۔

مگر ——!

"نو اگر مگر —— ہم ماسٹر —— ہم سائینٹسٹ —— یو شٹ اپ!"

لولا ایک تیکھے انداز سے مسکرا کر چپ ہو گئی۔ ماسٹر کی پیٹھ پر تیل مالش ہوتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر نے کروٹ لی اور سیدھا لیٹ گیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ لولا کی جانب بڑھا کر بولا۔

کِس می!

نو! لولا انکار میں سر ہلا کر بولی۔

کِس می!! ماسٹر نے بڑی بے چینی سے دونوں ہاتھ ہلا کر کہا۔

تمہارے منہ پر تیل ہے! لولا نے اعتراض کیا۔

نئی گاڑی مانگتا؟ ماسٹر نے پوچھا۔

لولا کے چہرے پر ہونٹ شبنم میں بھیگے ہوئے گلاب کی مانند کھل گئے ہنس کر بولی "ہاں!"

کیڈی لیک؟

ہاں!

یس ممی!

لولانے خوش ہو کر اپنے دونوں بازو ماسٹر کے گلے میں ڈال دیئے

تجربہ کرنے کے دوران میں کئی بار ماسٹر نے میرے جسم سے خون نکالا۔ کئی بار داخل کیا۔ کئی بار طرح طرح کے انجکشن دیئے جن سے میرے سارے جسم پہ طرح طرح کے پھوڑے نمودار ہو گئے۔ اور اُن سے پیپ بہنے لگی۔ ماسٹر اپنی تجربہ گاہ میں مجھے ایک اندھیرے کمرے میں بند کر کے رکھتا تھا۔ کسی وقت مجھے اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ میرے گلے میں ہر وقت لوہے کی ایک موٹی زنجیر پڑی رہتی تھی ......

ایک روز مجھے بے حد تکلیف تھی۔ پھوڑوں سے پیپ اور خون بہہ رہا تھا۔ سارے جسم میں بخار کی شدید کیفیت تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں آج مر جاؤں گا۔ اب تک میں نے زبان نہ کھولی تھی لیکن اپنی موت سامنے کھڑی دیکھ کر بولنا پڑا۔ وہ اس وقت میرے کمرے میں اکیلا کھڑا مجھے کسی دوا کا انجکشن دے رہا تھا۔

جب وہ انجکشن دے چکا۔ تو میں نے کہا۔

"نیم حکیم خطرۂ جان!"

وہ میری آواز سن کر حیرت سے اُچھل پڑا۔
تُو بولتا ہے ___ تُو گدھا بولتا ہے؟ اُس نے گھبرا کر پوچھا۔ اور انجکشن کی سرنج
اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔
میں نے کہا "ہاں ماسٹر میں بولنے والا گدھا ہوں پڑھا لکھا گدھا ہوں
تم نے میری کہانی اخباروں میں پڑھی ہوگی" میں نے اُسے یاد دلایا۔
وہ حیرت سے وہیں کھڑے کا کھڑا تھا۔ اور منہ کھولے میری طرف دیکھے
جا رہا تھا۔ آخر میں نے اُس سے کہا۔
آخر تم میری جان لینے پر کیوں تُل گئے ہو؟
تجربہ! وہ بولا۔
میں نے کہا۔ میں ایک پڑھا لکھا گدھا ہوں۔ میں تمھیں اپنی زندگی سے
کھیلنے کی اجازت نہ دونگا!
وہ بولا۔ تم بچ جاتا ___ ہم تیار کرتا ___ اپنی ناسور سیرم!___
تم مر جاتا ___ ہوتا شہید ___ سائنس پر!
میں نے کہا "میں شہید ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں زندہ رہنا
چاہتا ہوں"
"گدھا ہوتا ___ ہر جگہ شہید ___ مرا کرتا ___ دوسرا لوگ!"

وہ ہنس کر بولا۔ اُس کی ہنسی میں بڑی بے رحمی تھی!

"خدا کے لیے میری بیڑیاں کھول دو۔ مجھے آزاد کر دو!" میں درد اور دُکھ اور خوف سے بے چین ہو کر چلّایا۔

"شٹ اَپ!" ماسٹر زور سے چلّایا اور کمرہ بند کر کے چلا گیا۔

شاید قدرت کو میری زندگی منظور تھی۔ کیونکہ اس واقعہ کے چند روز بعد خود بخود میرے زخم اور پھوڑے اچھے ہونے لگے۔ اور ایک مہینے کے بعد میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ مگر اس پر بھی اُس ظالم نے مجھے کمرے سے باہر نہیں نکالا۔ بلکہ مزید دو ہفتوں تک مجھے اپنے مشاہدے میں رکھا آخر جب اُسے یقین ہو گیا کہ میں بالکل صحت یاب ہو چکا ہوں۔ تو وہ ایک روز میرے پاس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں دواؤں کا ایک پیکٹ تھا۔ اور وہ بے حد خوش معلوم ہوتا تھا۔

بولا "تجربہ کامیاب —— اینٹی ناسور سیرم —— ریڈی فار سیل۔ پیٹنٹ حاصل!" اتنا کہہ کر اُس نے وہ پیکٹ کھولا۔ اور کھول کر اُس میں سے اُس نے مجھے بارہ مہر بند کانچ کی شیشیوں کے سیرم دکھائے۔ ایک سیرم کا رنگ لال تھا۔ دوسرا بالکل سفید تھا۔

وہ بولا "ایک دن —— لال انجکشن —— دوسرے دن ——

سفید انجکشن ـــــ بارہ روز ـــــ ناسور ٹھیک "

میں نے پوچھا یہ لال رنگ کی دوا کیا ہے ؟

وہ بولا - اینٹی ناسور سیرم !

اور یہ سفید رنگ والی دوا -

سادا پانی -

پانی ؟ میں نے حیرت سے پوچھا -

ہاں پانی ـــــ وہ بولا -

میں نے کہا "مگر سادہ پانی کے انجکشن دینے کی کیا ضرورت ہے -
اگر تم صرف اینٹی ناسور سیرم کے انجکشن بیچو - تو بارہ دن کے بجائے لوگوں کا ناسور چھ دن میں ٹھیک ہوا کرے گا !"

وہ بولا - پانی ـــــ نہیں دے گا تو ـــــ جاستی منافع ـــــ کدھر سے لے گا ؟

میں نے کہا - تم کو زیادہ منافع کی کیا ضرورت ہے - تم ایک باعزت سائنس دان ہو - تمھاری اپنی ایک فیکٹری ہے دوائیوں کی جس سے ہر سال تم کو تین چار لاکھ کا فائدہ ہو جاتا ہے - کیا یہ کافی نہیں ہے ؟

وہ بولا - ایک لڑکا پیرس میں پڑھتا - دوسرا لندن - دو لڑکی جوان شادی ہونا

—— ایک بیوی —— ایک میم صاحب —— بڑا خرچہ مانگتا ‘‘ —— ہم پانی بیچتا!

میں نے کہا۔ اب تک میں سمجھتا تھا کہ تم صرف گدھوں کی زندگی سے کھیلتے ہو۔ اب معلوم ہوا تم انسانوں کی زندگی سے بھی کھیل سکتے ہو چار پیسوں کے لیے۔

دودھ میں پانی۔ شراب میں پانی۔ دوا میں پانی!

وہ میری بات سن کر ہنسا۔ بولا۔ کھالی بیچتا —— ادھر ہم —— پانی —— اُدھر ہمارا۔ بڑا بھائی —— بناتا ایٹم بم! سائنس دان وہ سائنس دان ہم!

تم دونوں چور —— گدھوں کے دشمن! میں نے جل کر کہا۔

بعد میں میں نے سوچا۔ ایچ بی ماسٹر سے روٹھنا فضول ہے۔ اپنی آزادی کیلئے
کوشش کرنا چاہیئے۔ لہذا چند دنوں کے بعد میں نے اُس سے کہا۔
تمہارا تجربہ تو کامیاب ہو گیا۔ اب تو مجھے آزاد کر دو۔
ماسٹر نے بڑی سختی سے سر ہلایا۔ بولا۔ نیا تجربہ —— کرتا ہم ——
تم کو —— بھوکا رکھتا!
میں نے گھبرا کر کہا۔ مجھے بھوکا کیوں رکھو گے؟
نیا انجکشن —— بناتا ہم —— بھوک کا انجکشن!

یہ بھوک کا انجکشن کیا ہوتا ہے ؟

ماسٹر نے مجھے دیر تک سمجھایا ۔ اُس کی گفتگو کا لب لباب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ تھا ۔ کہ اس دُنیا میں بھُوک بہت ہے ۔ ہر انسان کو بھوک لگتی ہے ۔ اُس کی بھوک مٹانے کے لیے اُسے روٹی کھلانا پڑتی ہے ۔ ہر روز دو وقت اور یہ بہت مہنگا سودا ہے ۔ اس لیے میں کسی ایسے انجکشن کی تلاش میں ہوں جس سے انسان کو بھُوک نہ لگے ۔ بالکل بھُوک نہ لگے یہ تو ناممکن ہے لیکن ہاں ایسی دوا ضرور ایجاد کی جاسکتی ہے جس سے انسان کو آٹھ دس دن تک بھوک نہ لگے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوا غذا کا کام دے گی ہرگز نہیں ۔ وہ تو صرف بھُوک کو آٹھ دس دن کے لیے دبا دیگی ۔ انسان اِن آٹھ دس دنوں میں کمزور تو ہوگا مگر بھُوک محسوس نہیں کریگا ۔ اور آٹھ دس دن تک بغیر غذا کے کام کر سکے گا ۔ ذرا سوچو تو ۔ اگر میں یہ انجکشن ایجاد کرنے میں کامیاب ہوجاؤں تو اِس سے دُنیا بھر کے صنعت کاروں کو کتنا فائدہ پہنچے گا ۔ ایک کارخانے کے ہزاروں مزدوروں کو ایک دن ایک انجکشن لگا دیا ۔ اور دس دن تک بغیر غذا کے اُن سے کام لے لیا ۔ میں ایک ایسی ہی دوا کی ٹوہ میں ہوں ۔ اور تمھارے خون سے اینٹی بھُوک سیرم تیار کر دں گا ۔ اور ساری دُنیا میں پیٹنٹ کرا کے اُسے بیچوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے دل میں سوچا۔ لو میاں گدھے۔ پہلے تو آزادی گئی۔ اب گھاس سے بھی گئے۔ عجیب پاگل سائنسدان سے پالا پڑا ہے۔ میں اُس کے سامنے بہت گڑگڑایا۔ رویا۔ گایا بہت بہت اُس کی منت سماجت کی۔ مگر ماسٹر کسی طرح مجھے آزاد کرنے پر تیار نہ ہوا۔

اب اُس کا ہر روز کا معمول ہو گیا۔ کہ وہ ہر روز مجھے ایک نیا انجکشن لگاتا دن بھر مجھے بھوکا رکھتا۔ اور رات کو پوچھتا "بھوک لگی؟"

"لگ رہی ہے" میں نے بھوک سے بے چین ہو کر کہا۔

دوسرے دن اُس نے پھر ایک نیا انجکشن لگایا۔ پھر شام کو پوچھا "لگ رہی ہے؟"

"لگ رہی ہے ماسٹر! سخت بھوک لگ رہی ہے ماسٹر!"

ماسٹر جھلا کر لوٹ گیا۔ چوتھے دن اُس نے پھر مجھے ایک نیا انجکشن دیا۔ پھر رات کو کہنے لگا۔ بھوک ختم؟

ارے آج تو مجھے اتنی بھوک لگی ہے۔ کہ اگر تم مجھے کھانا چھوڑ دو تو گھاس کی بجائے تمہیں کچا کھا جاؤں! میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

دس دن کے بعد مسلسل بھوک سے میری پسلیاں نکل آئیں۔ زندگی میں اتنے لمبے عرصے تک میں کبھی بھوکا نہ رہا تھا۔ بھوک اور کمزوری کی شدت سے میرا سارا

جسم کانپتا تھا۔ میں نے رو رو کر اُس سے کہا۔ مجھے تھوڑی سی گھاس دے دو۔ میری جان نہ لو۔ ماسٹر۔ ایسی کوئی دوا ایجاد نہیں کی جا سکتی جو بھوک کو مٹا دے ماسٹر۔ بھوک تو زندگی کی خاصیت ہے۔ زندگی مٹائے بغیر بھوک کو مٹانا مشکل ہے۔ اور پھر اس بھوک کو مٹانا کیوں ضروری ہے۔ آج بھی اِس دُنیا میں اتنی گھاس موجود ہے کہ ہر گدھا دونوں وقت آسانی سے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے۔ مگر تم اپنا لالچ تو بڑھاتے جاتے ہو۔ اور گدھوں کی بھوک کم کرنا چاہتے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

شٹ اپ۔ اُس نے میری پسلیوں میں زور سے ایک ٹھوکر ماری اور غصے میں بھرا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے سنجیدگی سے اس امر پر غور کرنا شروع کیا کہ اُس جنونی ڈاکٹر اور سائنس دان سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ورنہ یہ پگلا تو اپنے تجربے کرتا جائے گا۔ اور میں بھوک سے مر جاؤں گا۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے ایک ترکیب ڈھونڈھ نکالی۔ اور جب یہ ترکیب مجھے سوجھ گئی تو میں بے حد خوش ہوا۔ اور بے حد پریشان بھی ہوا۔ خوش اس لیے ہوا کہ چلو اب اپنی جان بچ جائے گی۔ اور پریشان اپنی حماقت پر اس لیے ہوا کہ میں بھی کیسا گدھا ہوں۔ اب تک اِتنی اچھی ترکیب مجھے کیوں نہیں سوجھی تھی۔

دوسرے دن ہی میں نے اپنی تجویز پر عمل کرنا شروع کیا جب دوسرے دن ماسٹر نے اُسکے حسب معمول مجھ سے بھوک کے بارے میں سوال کیا۔ تو میں نے ہنس کر کہا۔

بھوک ؟ بھوک کیا چیز ہے ؟ ہوا کیا ہے ؟

کبھی تم ——— بھوکے نہیں ؟ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

ہرگز نہیں ! میں نے اپنی بھوک کو چھپاتے ہوئے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے ماسٹر ! جیسے ——— میں ایک سو سال تک گھاس کھائے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں !

اوگاڈ ! ——— اب میں ——— کروڑ پتی ——— ارب پتی ——— اینٹی بھوک سیرم !

ہاہاہا ! میں زور سے ہنسا۔ یقین نہ ہو تو گھاس سامنے لاکے رکھ دو۔

ماسٹر نے میرے سامنے بہت سی گھاس سامنے لاکے رکھی۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ گھاس پر بھوکوں کی طرح گر پڑوں۔ اور ایک ایک تنکا چبا چبا کے کھا جاؤں۔ مگر میں نے منہ پھیر لیا۔ اور گھاس کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر کہا۔

ارے یہ تو گھاس ہے۔ میں نے بے حد نخوت سے کہا۔ اگر اس وقت تم میرے سامنے بریانی بھی لاکے رکھو تو اُسے بھی نہ چکھوں !

شاباش! گریٹ! ماسٹر خوشی سے چلّایا۔ اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر
مجھ سے بغلگیر ہونے لگا۔

میری جان! میری جان! ! آ! میری جان سنڈے کے سنڈے! ایزی
گانا شروع کیا۔ ماسٹر آج میرا جی گانے کو بھی چاہ رہا ہے۔ جانے تم نے کیسی
دوا مجھے دی ہے۔ ایک تو بھوک نہیں لگی اُوپر سے گانے کو جی چاہ رہا ہے

خاقوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

"ہرے!" ماسٹر نے میری زنجیر کھونٹے سے کھول کر اپنے ہاتھ میں لے
اور مجھے کمرے سے باہر لے جاتے ہوئے کہنے لگا۔ لولا.... لولا..
کم ہیئر..... دیکھو..... دیکھو۔ ڈنکی گاتا ــــ بھوکا ڈنکی گاتا!!

ماسٹر مجھے اپنی تجربہ گاہ سے نکال کر بنگلے کے باہر لان پر لے آیا۔ او
چلّا چلّا کر لولا سے کہنے لگا۔ دیکھو لولا۔ ڈرالڈ پرابلم ختم ــــ دیکھو گدھا ــــ
روٹی نہ ملتا ــــ پھر بھی گاتا....!

میں نے ناچ ناچ کر نیا گانا شروع کیا۔

جس کھیت سے میسّر ہو کسی گدھے کو روٹی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لولا اور ماسٹر دونوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ لولا ماسٹر کے گلے لگ
اور ماسٹر اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا۔
"اب ہم —— دونوں جاتا —— دُنیا گھومتا!"
یکایک میں نے موقع دیکھ کر زور کی ایک دولتی جھاڑی۔ ماسٹر کے ہاتھ
زنجیر نکل گئی۔ اور میں سرپٹ بنگلے کے دروازے کے باہر بھاگا۔
"کہاں؟ کہاں؟" ماسٹر حیرت سے بولا۔
میں نے کہا۔ اب ہم بھی باہر جاتا —— دُنیا کی سیر کرتا —— گوڈ بائی۔
سوائین! ماسٹر غصے سے چلایا۔
لوڈنگی! میں نے کہا۔ اور اپنی جان بچانے کے لیے تیزی سے بھاگا۔
ماسٹر لولا کو لے کر اُس کی نئی موٹر کی طرف بھاگا۔ اور اس کے ساتھ موٹر
بیٹھ کر بولا۔ جلدی کرو۔ گدھا پکڑو . . .
میں اپنی جان بچانے کے لیے تیزی سے بھاگا۔ مگر وہ پُرانے دنوں کی سی
اور پھُرتی مجھ میں موجود نہ تھی۔ دس دن کا بھوکا گدھا کہاں تک دوڑے گا
سڑک کا موڑ کاٹ کر ایک چھوٹے سے بازار میں بھاگا۔ بازار سے ایک
میں گھس گیا۔ لین میں گھس کر ایک گلی میں گھوم گیا۔ گلی اندر سے بند تھی
دوڑتا ہُوا گلی کے آخر تک چلا گیا۔ جہاں ایک نئی پانچ منزلہ بلڈنگ

کھڑی تھی۔ یہاں پہنچ کر میں بے بس اور مجبور ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ماسٹر کی موٹر چلی آ رہی تھی۔ پیچھے جا نہیں سکتا۔ آگے جاؤں تو کہاں جاؤں ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا۔ اور پھر کچھ سوچے بغیر بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ کر دوڑتا ہوا اندر ایک بڑے اور کشادہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

مجھے دیکھتے ہی ایک دھوتی پوش آدمی زور سے چلّایا۔

گورو جی ... گورو جی آ گئے۔ وہ دھوتی پوش دوڑتا ہوا آگے بڑھا اور آگے آ کر میرے پاؤں پر گر کر خوشی سے رونے لگا ....

گورو جی .... آپ کہاں چلے گئے تھے ... میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا تھا..... آپ کدھر الوپ ہو گئے تھے ... دھنیہ بھاگ ہو ... لے کر مایا ..... بجو ریا۔ داموریا .... کہاں مر گئے سب۔ جلدی سے منیم جی کو بلاؤ .....

میرے پاؤں چھو کر جب وہ اُٹھا اور نوکروں کو بلانے لگا تب میں نے اُسے پہچانا۔ وہ سیٹھ بھسوڑی مل تھا جس نے باہم میں مجھ سے سٹّے کا نمبر پوچھا تھا۔

سیٹھ بھسوڑی مل مجھے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ نچاتے ہوئے بولا "اُس دن لگی راج آپ نے جو نمبر دیا۔ اُس سے میں نے سٹّے میں تین لاکھ کما لیے۔

"دس ہزار!" بھسوڑی مل نے چلّا کر کہا۔ اور ماسٹر حیرت میں ڈ
اور میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگا کہ اس گدھے میں آخ
بات ہے جس کے لیے اُسے دس ہزار آفر کیے جا رہے ہیں۔ اُس کی
میں لالچ کی ایک تیز چمک پیدا ہوئی۔ مگر اُس نے پھر بڑی سختی سے کہا

"نہیں!"

"بیس ہزار!"

"نہیں!"

"تیس ہزار!"

"نہیں!"

چالیس ہزار۔ پچاس ہزار۔ ساٹھ ہزار۔ ستّر ہزار۔۔۔۔ بھسوڑی
بولتا چلا گیا۔

لولا نے جھنجھلا کر ماسٹر کی طرف دیکھا۔ ماسٹر نے زور سے سر ہلایا۔

"نہیں!"

"ایک لاکھ" بھسوڑی مل زور سے چیخا۔

ڈن! (DONE) لولا زور سے جواب میں چیخی۔ اور پھر ماسٹر کی
دیکھ کر اُسے سمجھاتے ہوئے بولی "پچاس ساٹھ روپے پر جتنے گدھے چاہو

جاتے ہیں۔ اس گدھے کے لیے ایک لاکھ مل رہا ہے۔ لے لو۔ ورنہ پھر کبھی یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ تم یقیناً اس رقم سے ایک گدھے کے بجائے گھوڑوں کا اصطبل خرید سکتے ہو!

ماسٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ کبھی میری طرف غور سے دیکھتا، کبھی سیٹھ بھسوڑی مل کی طرف۔ اس گدھے کے ایک لاکھ روپے؟ کیا بات ہے اس گدھے میں؟ جو وہ اس گدھے میں دریافت نہیں کر سکا؟ ایک لاکھ ایک گدھے کے؟

ایک لاکھ پچیس ہزار ـــــ بھسوڑی مل نے چیک لکھ کر ماسٹر کے سامنے رکھ دیا۔

"نہیں!" ماسٹر نے کہا۔

تو لے جاؤ اپنے گدھے کو! بھسوڑی مل نے چیک تہہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا!

یہ کہہ کر بھسوڑی مل نے میری زنجیر ماسٹر کے حوالے کر دی۔ ماسٹر مجھے لے کر دروازے کی طرف چلا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر تیزی سے پلٹا۔ اور بھسوڑی مل کے ہاتھ سے چیک لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور خاموشی سے میری زنجیر بھسوڑی مل کے حوالے کر دی اور لوٹا کر لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

جب وہ نظروں سے غائب ہو گیا تو بھسوڑی مل زور سے ہنسا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ بڑا بزنس مین بنتا ہے۔ آپ کے لیے تو میں دو لاکھ تک دینے کو تیار تھا۔ مگر وہ تو سوا لاکھ ہی میں راضی ہو گیا۔ احمق!

"مگر میرے خیال میں تو احمق تم ہو" میں نے کہا۔

اس نے سر جھکا کر کہا۔ آپ جو بولیں ٹھیک ہے۔ میں آپ کو کیا بول سکتا ہوں۔ ارے کوڑیا۔ بجوریا۔ داموریا۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔ جاؤ۔ ساتھ والا کمرہ اور باتھ روم گرو دیو جی کے لیے صاف کر دو۔ یہ آج سے ہمارے ہاں رہیں گے۔

دوسرے دن سیٹھ بھوسوڑی میرے کمرے میں بہت سے اخبار لیے داخل ہوا۔ اکثر اخباروں کے پہلے ہی صفحے پر جلی حروف میں یہ خبر چھاپی گئی تھی۔

"دنیا کا سب سے قیمتی گدھا"

"سیٹھ بھوسوڑی مل نے ایک لاکھ روپے میں خرید لیا!"

اکثر اخباروں نے میری سوانح حیات کے چیدہ چیدہ واقعات شائع کئے تھے۔ مشہور سائنس دان ایچ۔ بی۔ ماسٹر کا انٹرویو لیا تھا جس میں ان کے سائنٹیفک تجربوں کا ذکر تھا۔ جو انھوں نے مجھ پر کئے تھے۔ [illegible] کہ

رہا تھا۔ پھر سیٹھ بھسوڑی مل کا انٹرویو تھا جس میں اُنھوں نے بتایا تھا کہ یہ گدھا میرے لیے بے حد لکی ثابت ہوا ہے۔ اس لیے میں نے اسے ایک لاکھ روپے کے عوض خرید لیا ہے۔ اس پر جرنلسٹوں کی طرح طرح کی چٹکیاں تھیں۔ اکثر اخباروں کا پہلے صفحے کا آدھے سے زیادہ حصّہ میری خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے وزیروں کی تقریریں اور سیاسی ہنگامے پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔

سیٹھ بھسوڑی مل خوش ہو کر بولا۔ دیکھا کیسی شاندار پبلسٹی ہے تمھاری؟

میں نے کہا۔ میرے ساتھ آپ لوگوں کی بھی تو کافی پبلسٹی ہو گئی ہے!

وہ بولا۔ آج کل پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ اگر ایک گدھے کے ساتھ بھی پبلسٹی ملے تو یار لوگ اسے حاصل کرنے سے نہیں چُوکتے۔ اس لیے میں نے کل رات ہی چند جرنلسٹ دوستوں کو بلا کر اُنھیں یہ خبر بھیج دی تھی۔

میں نے اخبار تہہ کر کے الگ رکھ دیئے۔ اور سیٹھ بھسوڑی مل سے سوال کیا۔

آخر آپ کو ایک گدھے کے لیے ایک لاکھ روپے خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ سوال مجھے رات سے پریشان کر رہا تھا۔

سیٹھ بھوڑی مل مسکرا کر بولے "جو تمہیں گدھا سمجھتے ہیں وہ خود گدھے ہیں۔ میرے لیے تم کیا ہو۔ یہ میں ہی خوب جانتا ہوں۔ مگر اس وقت اس سوال پر بحث نہ کریں تو اچھا ہے۔ سب سے پہلے تو مجھے آپ کی صحت کی فکر ہے۔ اس قدر کمزور ہو گئے ہیں آپ کہ آٹھ دس بارہ پندرہ روز تک مکمل آرام کریں۔ بعد میں بات کر دوں گا۔"

چنانچہ پندرہ روز بڑے عیش و آرام میں گزرے۔ تین وقت عمدہ سے عمدہ گھاس کھانے کو ملی۔ اور ولائتی جَو کا دلیہ۔ اور گلوکوز کے انجکشن۔ اور تازہ پھلوں کا رس۔ اور وٹامن کی گولیاں اور دیگر مقوّیات اور دوائیں ایک باہر وٹرنری ڈاکٹر کی زیرِ نگرانی سب مجھے کھلائی گئیں۔ پڑھنے کے لیے اگاتھا کرسٹی کے ناول، جاسوسی اور رومانی رسالے۔ فلمی میگزین۔ اور وہ یورو پی رسالے بہم پہنچائے گئے جو صرف آرٹ پیپر پر شائع ہوتے ہیں۔ اور جن میں یا تو عورتوں کی ننگی تصویریں ہوتی ہیں یا مشہور مجرموں کے قتل و غارت کے لرزہ خیز حالات درج ہوتے ہیں۔

پندرہ دنوں کے بعد جب ڈاکٹروں نے مجھے صحت یاب قرار دیا۔ اور میں بالکل تندرست ہو گیا۔ تو سیٹھ نے میرے غسلِ صحت کے سلسلے میں ایک شاندار پارٹی دی۔ پارٹی انواع و اقسام کے کھانوں کے اعتبار سے بے حد شاندار

دھن میں راک این رول کا ایک ملا جلا ہندوستانی اور انگریزی گیت گانے لگا۔

جُو جُو جُو
کڑ واکڑوا ٹھُو
میٹھا میٹھا ہپّ
ٹوئسٹ اپ
یُو یُو یُو
جُو جُو جُو

میری جانا
میں تیرا جانی
تیرے میرے اُوپر
ایک مچھر دانی
سو ویٹ
شٹ اپ !

یکایک سیٹھ بھوڑی مل جُمّن دادا۔ گلاب سنگھ اور شباب سنگھ اپنی اپنی جگہ سے اُٹھے۔ اور آکر میرے پاؤں پڑ گئے۔

گرو مہاراج دیا کرو۔ سٹے کا نمبر بتا دو۔ اُس دن کی طرح! سیٹھ بھسوڑی مل میرے پاؤں پر اپنی ناک رگڑتے ہوئے بولے۔

سائیں لالہ۔ تیرا بول بالا۔ چمن بولا۔ بس ایک نمبر بتا دے!

ہٹو۔ کیا کرتے ہو۔ میں غصے سے بولا۔ میں کوئی یوگی راج یا سائیں نہیں ہوں محض ایک گدھا ہوں۔

ہم جانتے ہیں سب جانتے ہیں۔ وہ سب ایکدم بول اُٹھے۔

ارے خاک جانتے ہو۔ میں نے بھڑک کر کہا۔

میں کوئی سادھو سنت یوگی فقیر ہوتا تو اس طرح سے شراب پیتا؟

گرو مہاراج! ہم جانتے ہیں! بھسوڑی مل میرے پاؤں پر اپنا ماتھا رگڑ کر بولا۔ جو اگھوری سادھو ہوتے ہیں۔ یا دام مارگی تانترک ہوتے ہیں۔ وہ مانس مچھی انڈا شراب سب کھاتے پیتے ہیں جس جانور کا بھیس چاہے بدل لیتے ہیں۔

گرو مہاراج ہم آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے ہمیں سٹے کا نمبر دے دو۔

میں نے اپنا پاؤں چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ مگر گلاب سنگھ اور شتاب سنگھ نے اس سختی سے میرے دونوں پچھلے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔ کہ میں کسی طرح اپنے پاؤں اُن سے نہ چھڑا سکا۔ بالآخر مجھے کہنا پڑا۔ میرے پاؤں چھوڑ دو۔ مردود۔ تو بتاتا ہوں۔

اُن لوگوں نے فوراً میرے پاؤں چھوڑ دیئے۔ اور میں نے کچھ سوچ کر، ایک لمحوں کے توقف کے بعد جھوم جھوم کر ناچنا اور گنگنانا شروع کر دیا۔ پھر وہ لوگ بھی تالی پیٹ پیٹ کر میرے ساتھ ناچنے لگے۔ میں گانے لگا۔

اُدی دیکھی شملہ دیکھا
دیکھا میں نے کلّو
کلّو میں اُلّو
اُلّو میں چُلّو
چُلّو میں پانی
مر گئی چار دن کی نانی
نانی کے بیٹے گیارہ
جو جیتا وہ بھی ہارا

کہتے کہتے میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اور میں لڑکھڑا کر ایک طرف کو گر گیا۔ اور غش کھا گیا۔ مگر یہ سب کچھ بناوٹی تھا۔ مگر اُن لوگوں نے اسے بناوٹی نہیں سمجھا۔

مجمّن نے کہا۔ سائیں کو حال آ گیا ہے!

سیٹھ بولا۔ یوگی انتر دھیان ہو گئے!

گمگم گلاب سنگھ بولا۔ نمبر کب بتایا!

نمبر تو صاف بتایا۔ جگن بولا۔ مرگئی چاردن کی نانی۔ یعنی چوکا ضرور آئیگا۔
گلاب سنگھ بولا۔ مگر اوپن میں آئے گا یا کلوز میں آئے گا۔ یہ تو کچھ بتایا

نہیں۔

جگن بولا۔ فقیر کبھی صاف صاف نہیں بتاتے۔ مطلب نکالنا پڑتا ہے۔
میرے خیال میں تو یہ کلوز میں چوکا آئے گا!

"وہ کیسے؟" گلاب سنگھ نے پوچھا۔

ذرا غور کرو۔ جگن سوچتے ہوئے بولا۔ "مرگئی چاردن کی نانی ——— اب
موت کو آپ اوپن نہیں کہہ سکتے۔ موت تو ایک طرح کا کلوز ہے۔ زندگی اوپن
ہوتی ہے۔ موت پر کلوز ہوتی ہے۔ لہذا چوکا کلوز میں آئے گا۔

کیوں سیٹھ؟

سیٹھ نے غور کرتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں وہ جو یوگی راج نے کہا ہے
نانی کے بیٹے گیارہ ——— وہ مجھے ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ گیارہ ——— زیادہ
درست ہے!

مگر کئی نمبر تو دس ہوتے ہیں سیٹھ؟ گلاب سنگھ نے کہا۔

ہاں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یوگی نے اوپن کو کلوز دیا ہے۔ گیارہ یعنی
۱۱ یعنی ایک سے ایک، ۱

ہاں یہ مجھے ٹھیک لگتا ہے۔ اشتاب سنگھ نے کہا۔ اور شتابی سے نمبر لگانے چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی جمّن اور گلاب سنگھ بھی رفوچکّر ہو گئے۔ اب کمرے میں سیٹھ اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ اپنی دُھن میں غلطاں کھڑا کھڑا بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ بھی باہر چلا گیا۔

دوسرے دن نہ چوکا آیا نہ ایک سے ایک۔ بلکہ بندی سے بندی آئی یعنی صفر سے صفر۔ جمّن۔ گلاب سنگھ اور شتاب سنگھ منہ لٹکائے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ مگر سیٹھ بے حد خوش تھا۔ آج اُس نے پھر دو لاکھ روپے کمائے تھے۔

مگر کیسے؟ جمّن نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں خود بھی بہت حیران تھا۔ کہ نہ چوکا آیا۔ نہ ایک سے ایک پھر بھی سیٹھ نے دو لاکھ کیسے کما لیے۔

سیٹھ مسکرا کر بولا۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد میں دیر تک غور کرتا رہا۔ ہو نہ ہو۔ یوگی مہاراج اتنی آسانی سے نمبر بتانے والے نہیں ہیں ضرور اس میں کوئی اُلجھاوا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میری سمجھ میں آیا۔ کہ یوگی راج نے سب سے آخر میں جو بات کہی وہی سب سے اہم ہے!

جو جیتا وہ بھی ہارا، جمّن نے پوچھا۔

بالکل وہی! اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ ہار جیت برابر یعنی معاملہ صفر۔ بلکہ صفر سے صفر اس لئے ہیں نے صفر سے صفر پر داؤ لگا دیا کمال ہے۔ میں نے کہا۔ سیٹھ تم مجھے کتنا سمجھتے ہو؟

ساری عمر آپ لوگوں ہی کی جوتیاں سیدھی کی ہیں! سیٹھ بھنگوری مل خوش ہو کر بولا۔

جمّن نے کہا۔ تو آج جو نمبر تم بولو گے سیٹھ! سائیں کی بات سن کر جو نمبر تم خوب غور کر کے سوچو گے اس پر ہم لگائیں گے۔ مگر ہم سے دھاندلی مت کرو کہ تم تو خود کچھ اور لگاتے ہو۔ اور ہمیں کوئی اور نمبر دیتے ہو!

آج تو میں کوئی نمبر بتانے والا ہی نہیں ہوں۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

کیوں لوگی راج! مجھ سے کیا قصور ہوا ہے؟ سیٹھ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔۔۔۔

میں نے کہا۔ بات در اصل یہ ہے۔ کہ میں صرف پورنماشی کے روز نمبر بتا سکتا ہوں۔ مجھے صرف اسی روز نمبر بتانے کی اجازت ہے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ آج تو معاملہ کسی طرح ٹل گیا۔ اور اپنا بھرم رہ گیا۔

اب اگر ہر روز یاں سے شراب پی کر بکواس شروع کی۔ تو ایک نہ ایک دن پکڑا جاؤں گا۔ اور یہاں میں بڑے مزے میں تھا۔ اگر ایک ماہ اور آرام اور سکون کو مل جائے تو کیا بُرا ہے۔ اگلی پورنماشی کو دیکھیں گے۔ اُس دن بھی اگر ان لوگوں نے میری بکواس سے اپنے ڈھب کا کوئی نمبر نکال لیا تو پوں بارہ۔ ورنہ دُم دبا کے بھاگ جائیں گے۔ یا یہ لوگ خود ہی ڈنڈے مار کے نکال باہر کرینگے۔

گلاب سنگھ بولا سیٹھ۔ مہینے میں ایک نمبر بھی ٹھیک سے مل جائے تو سال بھر کی روٹی چل جاتی ہے۔ ایک پگلا بابا میں نے دیکھا تھا۔ یہ تو خیر بولتے بھی ہیں۔ اُس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ وہ مہاراج ہمیشہ چُپ سادھے رہتے تھے۔ اُن کا نمبر بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ مگر جب ملتا تھا تو تبدیل کر دیتے تھے۔ لوگ ہر وقت اُن کے گرد ڈیرے جمائے رہتے تھے۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ جب وہ چُپ رہتے تھے تو نمبر کیسے بتاتے تھے۔ لکھ کر!

جی نہیں گلاب سنگھ بولا۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ بڑی عجیب عجیب حرکتوں سے نمبر بتاتے تھے۔ ایک دفعہ اُنھوں نے میرے مُنہ پہ پان کی پیک پھینک دی۔ میں اُسی وقت اُٹھ کے گیا۔ اور پانچا لگا دیا۔ آگیا۔ پھر ایک روز اُنھوں نے مجھے اپنا ڈنڈا کھینچ کر مار دیا۔ میں نے اُسی وقت بھاگ کے اکّا

لگا دیا۔ کیونکہ ڈنڈا بالکل اِیکے کے ہندسے کی طرح ہوتا ہے! ایکا بھی آ گیا بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ایک دن یکایک بمبئی سے الوپ ہو گئے۔ پھر کبھی نہیں ملے۔ ورنہ میں تو اب تک عمر بھر کی روٹیاں اُن کی خدمت کر کے کھری کر لیتا!

سیٹھ میرے پاؤں دباتے ہوئے بولا۔ فکر نہ کرو گلاب سنگھ۔ اب گورُو مہاراج کے قدموں کی خاک سے ہمارا بیڑا پار لگ جائے گا۔ اگلی پورنماشی تک انتظار کرو۔

ڈگی پورنماشی کے روز ہیں نے سیٹھ سے صاف صاف کہہ دیا۔ ہم آج نمبر نہیں بتائیں گے۔

کیوں مہاراج ؟

مجھ کو آج ہمالیہ سے بلاوا آیا ہے۔ جوگی سدھ ناتھ جو ہمارے گورو ہیں اور جو کیلاش پربت پر دو ہزار سال سے سمادھی لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ ہم سے بہت خفا ہو گئے ہیں۔ ہمیں آج چلا جانا چاہیئے۔

"کیوں مہاراج۔ آپ کے گورو آپ سے کیوں خفا ہیں ؟"

"بیٹا بھسوڑی مل! میں نے سیٹھ سے کہا کہ گورو ہم سے اس لیے خفا ہیں کہ ہم بمبئی آ کر اپنے کرتویہ کو بھول گئے۔ گورو مہاراج نے ہم کو اس لیے بمبئی آنے کی آگیا دی تھی۔ کہ ہم بمبئی جا کر گورو کے مٹھ کے لیے اکیس لاکھ کا چندہ جمع کر کے لائیں۔ یہاں آ کر ہم تیرے پلّے پڑ گئے۔ اور تو ہم سے سٹّے کا نمبر لیتا ہے۔ اور ہمارے گورو کے مٹھ کے لیے کچھ نہیں کرتا!"

آپ حکم کریں مہاراج۔ میں ابھی ایک لاکھ کا چیک کاٹتا ہوں!

ایک لاکھ سے کیا ہوگا بیٹا بھسوڑی مل۔ اور ہم کو چاہیئے اکیس لاکھ اور ہمارے گورو کا حکم ہے۔ کہ صرف ایک آدمی سے اکیس لاکھ مانگنا اور اگر اس نے نہ دیا تو پھر کسی سے مت مانگنا واپس ہمالیہ چلے آنا۔

میرے پاس اکیس لاکھ تو نہیں ہے گورو جی! سیٹھ بھسوڑی مل پریشان ہو کر بولا۔

تو ہم کہاں تم سے اکیس لاکھ مانگتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہماری دھیان گیان کی باتوں سے تو جو نمبر نکالے اور اس سے جو کمائے۔ اس کا آدھا ہمارے نام سے بنک میں جمع کرتا جائے جب اکیس لاکھ ہو جائے گا تو ہم اسے لے کر ہمالیہ چلے جائیں گے۔

مجھے منظور ہے! مجھے منظور ہے مہاراج سیٹھ بڑی لجاجت سے بولا۔

آپ جو فرمائیں مجھے منظور ہے۔ میں تو آپ کے نمبروں کا میرا مطلب ہے آپ کے چرنوں کا داس ہوں۔

مقررہ وقت پر پھر محفل جمی۔ پھر وہسکی کا دور چلا۔ آج میں نے اچھی طرح سے سوچ لیا تھا کہ ایسی انٹ سنٹ ہانکوں گا کہ کسی کے پلے کچھ نہ پڑے اس کے بعد بھی اگر وہ لوگ کوئی نمبر نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔ تو میرا آدھا حصّہ تو کھرا ہے اور نہ وہ لوگ مجھ پر کسی قسم کا الزام دھرنے پر کامیاب نہ ہوں گے۔ اور اپنا کچھ وقت اور مزے میں کٹ جائے گا۔ یہ دُنیا ہے ہی ایسی، یہاں پر ایمانداری، سچائی، دیانتداری اور آدرش کی بلندی کا مطلب یہ ہے۔ کہ آدمی بھوکا رہے اور کڑھ کڑھ کر دوسروں کے لیے گدھا بن کر مر جائے۔ اب تو ان لوگوں کے ساتھ میں بھی ایسا ہی سلوک کروں گا۔ جیسا یہ اب تک مجھ سے کرتے آئے ہیں۔ ان کا جوتا انہی کے سر رکھ دینا چاہیئے، ورنہ ہمارے لیسے سر پھرے گدھوں کے لیے کہاں جگہ ہے۔

لیکن جب نمبر بنانے کا وقت آیا تو میرے دل میں عجب غصّہ سا جگہ پانے لگا۔ کیسے احمق اور لالچی ہیں یہ لوگ کتنے جاہل اور پیسے کے پجاری

ان کے لیے مذہب، سیاست، سماج، معاشرہ، حیثیت، کلچر، تہذیب انسان کا مستقبل ایسے الفاظ کوئی معنی ہی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ روپے کے محدود دائرے میں گھرے ہوئے اپنے ضمیر پر پٹی باندھے ہوئے ماضی حال اور مستقبل سے بے نیاز اپنی حرص کے کولھو کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ یہ چاروں کے چاروں کس طرح اپنے چہرے اٹھائے ہوئے میری طرف کیسی احمقانہ التجا سے دیکھ رہے ہیں، جیسے میرے ایک لفظ سے اُن پر چاروں طرف سے نوٹوں کی بارش شروع ہو جائے گی۔

" سوئر کے بچے، حرامی!" میں نے غصے میں جھنجلا کر کہا۔ وہ چاروں ایک لمحے کے لیے چونک گئے۔ پھر ایسے ٹھس سے بیٹھ گئے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ محنت نہیں کریں گے۔ کام نہیں کریں گے۔ دیش کی دولت میں ایک پائی کا اضافہ نہیں کریں گے۔ مگر سٹہ، جوا، ریس، سمگلنگ، بدمعاشی، غنڈہ گردی، آوارگی، جعلسازی، بددیانتی، چوری، ڈکیتی، کنبہ پروری، رشوت، قتل۔ ہر برے سے برے کام کو جائز روا رکھیں گے۔ پھر اس بات پر مگرمچھ کے آنسو بہائیں گے کہ یہ ملک ترقی کیوں نہیں کرتا۔ سماج آگے کیوں نہیں بڑھتا۔ غریبی دُور کیوں نہیں ہوتی۔ لوگ خوش حال اور خوش سلیقہ کیوں نظر نہیں آتے؟ سالے چور، اچکے، بدمعاش، گنڈے، کمینے، جانتے ہیں کہ

پھو منتر کر کے لاکھوں روپے ایک لمحے میں کما لیں۔ نمبر بتا دو! نمبر بتا دو!!
کیوں نمبر بتاؤں میں؟ نہیں بتاتا! نہیں بتاتا۔ جاؤ جو کرنا ہے کر لو جیرے
بھنگے سے!

مارے غصّے کے میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اور میں تھر تھر کانپنے لگا
ان کے منحوس لالچی چہرے کیسے بدصورت اور مسخ شدہ نظر آ رہے تھے۔
لق اور جھکے ہوئے۔ میں نے انتہائی کراہت کے عالم میں ان سے منہ پھیر
لیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور دروازے کی آڑ لے کر ان کی باتیں سننے لگا۔
نشاب سنگھ کہہ رہا تھا۔ اس گدھے کو ہوا کیا ہے؟ ہمارا کھاتا ہے۔
ہمیں ہی گالی دیتا ہے۔ وہسکی یہ پیئے۔ پھلوں کا رس اس کے لیے آئے
دو نوکر اس کی مالش اور مٹھی چاپی کریں۔ سونے کے لیے عمدہ بستر رہنے کے لیے
عمدہ کمرہ۔ جھاڑ فانوس۔ غالیچے گاؤ تکیے۔ ٹیلیفون۔ زندگی کی ہر نعمت اس
کے لیے مہیّا ہم کریں۔ اور یہ کمبخت ہمیں کو گالی دے۔ میں اس کو ابھی پستول مار کر
ہلاک کرتا ہوں۔

نہیں۔ نہیں۔ تم نہیں سمجھے نشاب سنگھ جمن بولا۔ سائیں کو جلال آگیا
ہے۔ ضرور ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔
جمن ٹھیک کہتا ہے۔ گلاب سنگھ نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

یوگی راج ہم سے خفا ہیں۔ ضرور ہم سے کوئی اپرادھ ہوا ہے۔

اجی کچھ نہیں ہوا۔ سیٹھ بھوڑی مل ہنس کر بولا۔ سادھو کا پکن تو آکاش بانی ہوتا ہے۔ اُس کی گالی بھی گلاب ہوتی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ مہاتما نے نمبر بتا دیا ہے۔

نمبر بتا دیا ہے کہ گالی دی ہے؟ شتاب سنگھ نے غصے سے کہا۔

ہائیں۔ نمبر بتا دیا ہے؟ وہ کیسے؟ گلاب سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔

ذرا سوچ کر بتاؤ کہ گفتگو شروع کرتے وقت یوگی راج نے ہمیں کونسی گالیاں دیں؟

اجی اُس نے چھوٹتے ہی ہمیں سؤر کا بچہ اور حرامی کہا۔ اور آخر میں سالے، چور، اُچکے بدمعاش کتے کمینے کہا۔

شتاب سنگھ بھڑک کر غصے سے لال ہو گیا۔

گویا شروع میں دو گالیاں دیں۔ اور آخر میں چھ گالیاں؟ سیٹھ بھوڑی مل خوش ہو کر بولا۔ بس اب تو معاملہ صاف ہے۔ آج اوپن میں دو آئے گا اور کلوز میں چھکا۔ آج مہرشی نے ہمیں جی بھر کر گالی دی ہے۔ اس لیے آج جی بھر کے اسی نمبر پر سٹہ کھیل دو۔ آخری پائی بھی لگا دو یارو۔ دوئے اور چھکے پہ! آج موقع ہے۔ ساری بمبئی لوٹ لو۔

ایک لمحہ کے لیے اُن لوگوں نے حیرت اور تعجب اور مسکراہٹ کی نگاہوں سے سیٹھ بھوڑی مل کی طرف دیکھا۔ پھر وہ چاروں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئے۔ اور ایک دوسرے کا خوشی سے منہ چومنے لگے۔ میں بھاگ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور ان لوگوں کی فطرت پر غور کرنے لگا۔ جو روپے کی خاطر گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہ ہوتے تھے۔ اتنی بات تو بالکل صاف ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا۔ اگر کل یہ نمبر نہ آئے۔ تو اپنی جان کی خیر نہیں۔ نشاب سنگھ مجھے فوراً گولی مار دے گا۔ میں نے نکل بھاگنے کے لیے کئی پلان بنائے۔ مگر اس قدر کڑا پہرا تھا مجھ پر۔ کہ مجھے بھاگنے کی مہلت نہ ملی اور رات کو سوتے وقت میرا کمرہ باہر سے مقفل کر دیا گیا۔

صبح کے وقت جب کمرہ کھولا گیا۔ تو میں ہراساں اور لرزاں اپنی موت کی توقع میں چپ چاپ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اُن چاروں کو اپنے سامنے متین اور سنجیدہ دیکھ کر میری گھگھی بند ہوگئی۔ آج موت آگئی گدھے! اب تیار ہو جاؤ۔ میں پریشان ہو کر پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ لوگ اندر آتے ہی آگے بڑھے اور چاروں کے چاروں میرے پاؤں پر گر پڑے!

میرے پاؤں پر گر پڑے!

دوسٹے سے چھکا آگیا تھا!

جمن نے ستر ہزار کمائے تھے۔
گلاب سنگھ نے تیس ہزار۔
شتاب سنگھ نے پچاس ہزار
سیٹھ بھبوڑی مل نے اپنی ساری جمع پونجی لگا دی تھی۔ اُس نے چونسٹھ
لاکھ کما لیے تھے۔
چونسٹھ لاکھ!
ایک داؤ میں چونسٹھ لاکھ!!

باپ رے!!!
اب وہ لوگ خوشی سے ہنستے جاتے تھے۔ اور خوشی سے روتے جاتے
تھے۔ اور میرے پاؤں پر بوسہ دیتے جاتے تھے۔ اور مسرت اور شادمانی حیرت
اور استعجاب سے اُن کے گلے سے عجیب و غریب چیخیں اور کراہیں نکل رہی
تھیں۔ اور جو کچھ وہ بول رہے تھے وہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کبھی چند
لفظ سمجھ میں آجاتے۔ بھگوان ..... مالک .... حسنی ..... دیوتا..
... سائیں .... فقیر۔ درویش ... میں نے اکدم کڑک کر کہا۔ نکل
جاؤ۔ ابھی نکل جاؤ کمرے سے .... ہم تخلیہ چاہتے ہیں۔
وہ لوگ میرے پاؤں چھوڑ کر اُلٹے پاؤں بھاگے۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے

نرنجر کانپتے ہوئے کمرے سے باہر جانے لگے۔ تو میں نے گرج کر پھر کہا۔
سیٹھ کو یہیں چھوڑ جاؤ!

جب سیٹھ اکیلا میرے سامنے کھڑا رہ گیا۔ تو میں نے چند لمحے غور سے
س کی طرف گھور کر دیکھا۔ سیٹھ نے نظریں جھکا لیں۔ اُس کے سارے بدن
پر رعشہ طاری تھا۔

میں نے پوچھا۔ سچ سچ بتاؤ۔ تم نے کتنے کمائے ؟

چونسٹھ لاکھ گرو دیو۔ صرف چونسٹھ لاکھ!

تو میرے بتیس لاکھ مجھے دے دو۔

ابھی لیجئے مالک! سیٹھ بھوڑی لال گھبرایا ہوا بھاگتا ہوا اپنے بیڈروم
میں گیا اور اپنی تجوری کھول کر ہزار ہزار کے بتیس سو نوٹ لے کر آیا۔ اور
نوٹ لا کر اُس نے میرے قدموں میں ڈھیری کر دیئے۔

بتیس لاکھ کے نوٹ دیکھ کر میرا دل للچایا۔ اور میرا لہجہ بدلا۔ اور میں نے
کہا۔ بچہ۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ تُو اپنے امتحان میں پُورا اُترا۔ اس
خوشی میں ہم تمہیں مزید دو لاکھ کا انعام عطا کرتے ہیں۔ اس ڈھیری میں
سے دو لاکھ کے نوٹ اُٹھا لے۔ اور باقی تیس لاکھ کے نوٹ لے کر
ہمارے ساتھ بینک کو چل!

"دھاناگڑھ سے کا دی گریٹ نیشنل سٹار بینک آف انڈیا میں - اور جمع کرانا تیس لاکھ روپے کا اور ملاقات کرنا بینک کے جنرل منیجر سے"

بینک کے مینیجر سے ایک اسسٹنٹ نے کہا۔
آپ سے ملنے کے لیے ایک گدھا آیا ہے۔
گدھا؟ گدھے کا بینک میں کیا کام؟ بینک کے مینیجر نے چونک کر پوچھا
بینک کے اندر آتے ہی سب لوگوں میں کھلبلی مچ گئی تھی کلرک لوگ اپنی
کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ایڑیاں اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھنے لگے۔ پیسے
نکلوانے والے اور پیسہ جمع کرانے والے سب مجھے حیرت اور پریشانی سے دیکھ
رہے تھے۔ پیشتر اس کے کہ وہ لوگ اپنے حواس مجتمع کر کے میرے داخلے کی

مخالفت کر سکتے سیٹھ بھسوڑی مل مجھے لے کر بینک کے منیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" بینک منیجر چلایا۔ پھر وہ سیٹھ بھسوڑی مل سے مخاطب ہو کر بولا۔ جناب والا۔ یہ بینک ہے اصطبل نہیں ہے!

سیٹھ بھسوڑی مل کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اُسے بات نہیں کرنے دی۔ میں نے آہستہ سے مسکرا کر کہا منیجر صاحب! اس دُنیا میں سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ جن لوگوں کو بینک میں ہونا چاہیئے وہ اصطبل میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو واقعی اصطبل میں ہونا چاہیئے وہ بینک میں پائے جاتے ہیں!"

بینک منیجر مجھے بولتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا نچلا جبڑا لٹکے کا لٹکا رہ گیا۔ ہکلا کر بولا ... آ ... آپ کی تعریف۔

ایک گدھے کی تعریف کیا ہو سکتی ہے؟ وہ بھلا اس لائق کہاں؟ میں آپ کا وقت ضائع نہ کرونگا۔ مجھے گدھا کہتے ہیں۔ اور میں آپ کے ہاں اپنا اکاؤنٹ کھولنے آیا ہوں!

ہمارے ہاں کسی گدھے کا اکاؤنٹ نہیں کھل سکتا!

کیوں نہیں کھل سکتا؟ میں نقد روپیہ لایا ہوں۔ آپ کا بینک جیلہ،

پینے کو تیار ہوں۔

آپ انسان نہیں حیوان ہیں۔

اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ کے ہاں جو لوگ آتے ہیں سب کے سب انسان ہیں۔ میں نے بہت سے انسانوں کو حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کرتے دیکھا ہے۔ بینک اکاؤنٹ رکھنے والے بہت سے ایسے انسانوں کو جانتا ہوں جنہیں دیکھ کر حیوانوں سے محبت ہو جاتی ہے!

میں مجبور ہوں صاحب! بینک منیجر میری باتوں سے پریشان ہو کر بولا۔ یہ ہمارے بینک کا قاعدہ ہے۔ ہم کسی جانور یا حیوان کا اکاؤنٹ نہیں کھول سکتے۔

انسان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ حیوانِ ناطق ہے۔ میں ایک بولنے والا گدھا ہوں۔ اس حد تک آپ بھی مجھے حیوانِ ناطق یعنی انسان سمجھ سکتے ہیں۔

بحث مت کیجئے۔ چلے جائیے۔ میں یہاں کسی گدھے کا اکاؤنٹ نہیں کھول سکتا۔ بینک منیجر نے بڑی سختی سے کہا۔

میں نے کہا۔ بس دو ایک باتیں بتا دیجئے۔ پھر میں چلا جاؤں گا!

فرمائیے!

یہ جو ہزاروں آدمی آپ کے بینک میں روپیہ جمع کرتے ہیں۔ ان کو آپ کیا دیتے ہیں ؟

دینے کا کیا مطلب ؟ ہم تو لیتے ہیں۔ بینک کا سُود !

یعنی ایک تو آپ ہمارا پیسہ اپنے پاس رکھیں اور پھر سُود بھی ہم ہی سے لیں ؟

نہیں۔ اگر آپ جنرل اکاؤنٹ کے بجائے سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈیپازٹ میں روپیہ رکھوا دیں تو ہم آپ کو سود دیں گے ؟

آخر آپ مجھے کیوں سُود دیں گے جب میرا روپیہ آپ کے پاس ہمیشہ جمع رہتا ہے۔ تو پھر آپ مجھے کیسے سود دے سکتے ہیں۔ کیا میرا روپیہ آپ کے پاس پڑا پڑا انڈے دیتا ہے ؟

مینجر ہنسا۔ بولا حضور والا قصّہ یہ نہیں ہے۔ وہ بات یہ ہے۔ کہ آپ ایسے ہزاروں لوگ جو اپنا تھوڑا تھوڑا اسینکڑوں کا سرمایہ ہمارے بینک میں جمع کرتے ہیں اُنھیں کے سرمائے کو جمع کرو تو لاکھوں کی رقم ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارے بینک کے ڈائرکٹر لوگ آپ کے سرمائے کو بڑی بڑی صنعتوں میں لگاتے ہیں۔ محفوظ جائدادیں خریدتے ہیں۔ اور لاکھوں کا منافع کماتے ہیں !

یعنی غریب آدمی اپنی مختصر سی پونجی حفاظت کے خیال سے تمھارے

ں اکاؤنٹ میں رکھتا ہے۔ اس کے لیے چارج میں رہتا ہے۔ اور تم ہم سب
پونجی جمع کر کے لاکھوں کا دھندا کر لیتے ہو؟

جی ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔

اور پھر تم کہتے ہو۔ اس بینک میں کسی گدھے کا اکاؤنٹ نہیں کھل سکتا؟
بینک مینجر میری بات سمجھ کر ہنس دیا۔ بولا۔ آپ بے حد ستم ظریف واقع
ے ہیں۔

غریب آدمی کبھی کبھی اپنی مصیبت کو ظرافت سے نہ ٹالے تو جینا محال ہو جائے
ا مینجر صاحب ہم جاتے ہیں!

یہ کہہ کر بینک مینجر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

میرے جانے کے بعد سیٹھ بھسوڑی مل نے بینک مینجر سے کہا۔ تم نے سخت
ں کی۔ دیا لو رام۔ یہ گدھا تیس لاکھ روپے جمع کرانے آیا تھا۔

تیس لاکھ؟ بینک مینجر زور سے چلایا۔

ہاں تیس لاکھ! سیٹھ نے سر ہلا کر کہا۔

تیس لاکھ! بینک مینجر کرسی سے اچھل کر باہر دروازے کی طرف دوڑا۔

۔ وہ گدھا کہاں ہے؟

بینک میں کھلبلی مچ گئی۔ سب لوگ مینجر کو بینک سے بھاگ کر باہر نکلتے ہوئے

میرے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ بینک منیجر چیخ رہا تھا۔
ابے او گدھے۔ یعنی کہ اجی جناب گدھے صاحب! ذرا سنئے تو سرکار
میری۔

میں نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔ کیا ہے ؟
بینک منیجر نے میری رسّی پکڑی اور بڑی لجاجت سے بولا۔ مجھ سے بڑی
غلطی ہوئی۔ دراصل مجھے آپ کو پہچاننے میں بڑی غلطی ہوئی۔ اب آپ اندر
چلئے اور اپنا روپیہ جمع کرا دیجئے۔
مگر میں تو ایک گدھا ہوں۔
اجی آپ گدھے کیا ، تو بھی ہوں۔ تو بھی کوئی مضائقہ نہیں!
میں ایک حیوان ہوں!
اجی آپ حیوان کیا شیطان ہوں جب بھی میں آپ کو نہ جانے دوں۔
چلئے۔ اندر چلئے۔
بینک کا منیجر فرشی سلام کرتا ہوا مجھے اپنے کمرے میں اندر لے گیا۔ لوگ
حیرت سے ہکّا بکّا رہ گئے۔
اندر جاتے ہی بینک کے منیجر نے زور سے گھنٹی بجائی۔ اکاؤنٹ کا فارم
لاؤ۔ دستخطی فارم لاؤ۔ پاس بک لاؤ۔ چیک بک لاؤ۔۔۔ جلدی کرو۔

پھر مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ آپ تیس لاکھ روپیہ جمع کرائیں گے ؟

"جی ہاں !"

ہم۔ بینک مینجر نے خوشی سے اپنی ہتھیلیاں رگڑیں۔ پھر بولا۔ میرے
ہیں آپ بیس لاکھ تو فکسڈ ڈیپازٹ میں رکھ دیجئے۔ پانچ لاکھ سیونگ
بنٹ میں اور پانچ لاکھ جنرل اکاؤنٹ میں !

جی نہیں۔ میں نے کہا۔ میں اکیس لاکھ روپے فکسڈ ڈیپازٹ میں رکھونگا
لاکھ سیونگ میں اور پانچ لاکھ جنرل اکاؤنٹ میں !

بیس کی بجائے اکیس لاکھ کیوں ؟ سیٹھ بھوڑی مل نے پوچھا۔

اکیس لاکھ روپے منٹو کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے سیٹھ
ڑی مل کو بتایا۔ وہ بھول گئے۔ گورو دجی نے جو مجھے ہمالیہ میں ٹھ کھولنے
لیے کہا تھا۔

سیٹھ بھوڑی مل کو یاد آگیا۔ اور اسے اطمینان ہو گیا۔

مینجر نے ایک فارم میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ اس پر دستخط کر دیجئے۔

میں نے کہا۔ میں دستخط نہیں کر سکتا۔ میں تو گدھا ہوں !

کوئی بات نہیں ! مینجر بولا۔ آپ انگوٹھا لگا دیجئے۔

گدھے کا انگوٹھا بھی نہیں ہوتا۔ سُم ہوتا ہے ۔

سٹم بن چلے گا! تیس لاکھ کی رقم کے لیے سٹم تو کیا گدھے کی دُم کا نشا

بھی چلے گا۔ منیجر مسکرا کر بولا۔ اور اُس نے فارم میرے سامنے رکھ دیئے

"سٹم لگائیے "

سیٹھ بھسوڑی مل نے کہا "ٹھہر جاؤ"

"کیوں"؟ میں نے پوچھا۔

سیٹھ بھسوڑی مل نے منیجر سے پوچھا۔ اس رقم پر آپ کو اوور ڈرا

کیا ملے گا؟

اوور ڈرافٹ کیا ہوتا ہے؟ میں نے پوچھا۔

سیٹھ بھسوڑی مل نے تشریح کرتے ہوئے کہا۔ بینک میں جتنا اکاونٹ

آپ اُس سے زیادہ بھی نکلوا سکتے ہیں۔ اُس کی ایک رقم مقرر ہو جاتی ہے۔

منیجر بولا۔ اس رقم پر میں آپ کو ایک لاکھ کا اوور ڈرافٹ دونگا

ایک لاکھ نہیں دو لاکھ! سیٹھ بھسوڑی مل بولا۔

چلئے دو لاکھ سہی۔ منیجر نے کہا۔ آپ سٹم لگائیے۔

جب میں فارموں پر سٹم لگا رہا تھا۔ اُس وقت ایک دُبلا پتلا پریشا

آدمی اندر آیا۔ اور بینک منیجر سے کہنے لگا۔ میری بیوی سخت بیمار ہے

بچے گی کہ نہیں بچے گی۔ مجھے اُس کی دوا دارو کے لیے ڈیڑھ سو روپے چاہئیں

اور میرے اکاؤنٹ میں صرف پچاس روپے جمع ہیں اس وقت۔ منیجر صاحب مجھے ایک سو کا اوور ڈرافٹ دے دیجئے۔ دو دن کے بعد پہلی تاریخ کو جب مجھے تنخواہ ملے گی۔ میں ایک سو روپے بینک میں جمع کرا دوں گا۔

آپ کا اوور ڈرافٹ بینک سے منظور ہے؟ منیجر نے پوچھا۔

جی نہیں، مگر میری بیوی سخت بیمار ہے۔ وہ مر جائیگی اگر۔۔۔

منیجر نے بات کاٹ کر کہا۔ ساری۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔

وہ آدمی روتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں نے منیجر سے کہا تیس لاکھ جمع کرانے والے گدھے کے لیے دو لاکھ کا اوور ڈرافٹ!! اور کسی کی بیوی بستر مرگ پر پڑی ہو۔ تو سو روپے بھی نہ ملیں؟ منیجر صاحب! آپ اپنے بینک کو انسانوں کا بینک کہتے ہیں؟

بینک کا منیجر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اتنے میں دروازہ پھر کھلا۔ اور ایک لمبے بالوں والا گورے رنگ کا آدمی جس نے بادامی رنگ کی سلک کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اور ایک سفید پتلون اور پشاوری چپل۔ جلدی سے ایک چیک لے کر اندر آیا۔ اور بولا۔

کنٹاکٹ فلم کمپنی والوں نے مجھے ڈیڑھ سو کا یہ چیک دیا تھا۔ مگر کلرک بولتا ہے۔ کنٹاکٹ فلم کمپنی کے حساب میں صرف ایک سو چالیس روپے جمع ہیں

"تو میں کیا کروں؟" منیجر نے تنک کر پوچھا۔

آپ ایسا کیجئے۔ کہ میں کلاکٹ فلم کمپنی کے حساب میں روپے اپنے پاس سے جمع کرائے دیتا ہوں۔ آپ ڈرافٹ میرا ڈیڑھ سو کا چیک پاس کر دیجئے سالا اپنا دس روپے ہی کا تو ماندہ رہے گا۔ ایک سو چالیس تو اپنے گھر میں آ جائے گا۔

اوکے! منیجر نے کہا۔ اور وہ لمبے بالوں والا آدمی فوراً باہر چلا گیا۔

یہ کون تھا؟ میں نے اس آدمی کی چالاکی سے متاثر ہو کر بینک منیجر سے پوچھا۔

یہ دادا دھمال ہے۔ کلاکٹ کمپنی میں فلم ڈائرکٹر ہے۔ پھر وہ مجھے پاس بک اور چیک بک دیتے ہوئے بولا۔ لیجئے صاحب۔ آپ کا کام ہو گیا۔ میرے لیے کوئی اور خدمت!

میں نے چیک بک دیکھ کر کہا۔ کیا اب میں اس اکاؤنٹ سے روپیہ نکال سکتا ہوں۔

جتنا جی چاہے نکال سکتے ہیں! منیجر بولا۔

اور چیک بک پر دستخط کے بجائے اپنا سٹم لگا سکتا ہوں۔

بے شک! آپ کے سُم کا نشان ہی آپ کا دستخط سمجھا جائیگا!

بہت خوب! میں نے سیٹھ بھوڑی مل سے کہا۔ اب آپ اس چیک پر ایک لاکھ کی رقم لکھ دیں۔ میں اپنا انگوٹھا لگائے دیتا ہوں۔

ایک لاکھ روپے لے کر ہم باہر آگئے۔ باہر آ کر سیٹھ نے مجھ سے پوچھا۔ گوردو اس رقم کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے کہا۔ زیادہ بکواس مت کرو۔ یہاں سے سیدھے نکڑ کی جنرل سٹورز کی دکان پر چلے جاؤ۔ اور اس رقم کے لیے ایک جھولا خرید کر لاؤ۔ اور اسے میری گردن میں لٹکا کے اس میں یہ ایک لاکھ روپیہ رکھ دو۔

سیٹھ بڑبڑاتا ہوا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا "ابھی سے اس گدھے کے مزاج میں گرمی آگئی ہے۔"

اس کا خیال تھا کہ میں نے نہیں سنا ہوگا۔ لیکن میں نے سن لیا تھا۔ خیر تجھے بھی ٹھیک کر دوں گا۔

جب سیٹھ نکڑ پہ غائب ہو گیا۔ تو میرے کانوں میں یہ آواز آئی۔

"سیٹھ؟"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تو مجھے کہیں سیٹھ دکھائی نہ دیا۔ پھر کانوں میں آواز آئی۔

"سیٹھ! میں تم سے مخاطب ہوں!"

اب جو میں نے دیکھا۔ تو دادا دھلالی تھا۔ کہہ رہا تھا۔
سیٹھ آئس کریم کھائے گا ؟

" نہیں !"

" جلیبی ؟"

" نہیں !"

" عمدہ گلوری پان کھائے گا فس کلاس !"

" نہیں !" میں نے انکار میں سر ہلا کے کہا۔ کیا؟ — بات کیا ہے؟
کیوں خوشامد کر رہے ہو؟

خوشامد تو ہم اپنے باپ کی بھی نہیں کرے گا۔ مگر تم کو ایک کام کی بات بتائے گا۔ ذرا ورا ذرا ادھر کونے میں آجاؤ۔

میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ دس منٹ تک میرے کان میں کھسر پھسر کرتا رہا۔ اور ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ جب اس نے دور سے سیٹھ بھسوڑی مل کو آتے دیکھا تو فوراً "پھر ملونگا" کہہ کر غائب ہو گیا۔ سیٹھ بھسوڑی مل نے نہ اُسے مجھ سے باتیں کرتے دیکھا۔ نہ غائب ہوتے دیکھا۔

میرے قریب آ کر سیٹھ بھسوڑی مل نے جھولا میرے گلے میں باندھا۔ اُس میں ایک لاکھ کے نوٹ گن کر ڈالے۔ میرے پاؤں چھوئے ! ورد ونلا

ہاتھ جوڑ کر بولا۔

گرو مہاراج! اب آپ ہمالیہ کب جائیں گے؟

ایک لاکھ کے نوٹ جھولے میں پڑتے ہی میرے سارے جسم میں ایک عجب سنسنی سی دوڑ گئی۔ رگوں میں دوران خون تیز ہو گیا۔ سر سے پاؤں تک اک انگڑائی سی آئی۔ پھر میں نے زور کی اک ہانک لگائی۔ اور کہا۔ احمق! اب ہم ہمالیہ نہیں جائیں گے۔ یہیں بمبئی میں رہیں گے۔

اور وہ —— وہ گدھوں کا مٹھ؟ سیٹھ نے پوچھا۔

وہ گدھوں کا مٹھ اب بمبئی میں ہی کھلے گا۔

یعنی؟ سیٹھ نے میری طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔

یعنی ایک فلم کمپنی!

فلم کمپنی؟؟ سیٹھ بھسوڑی مل زور سے چیخا۔ گرو جی۔ آپ تباہ ہو جائیں گے برباد ہو جائیں گے۔

ہم نہ تباہ ہوں گے۔ نہ برباد ہوں گے۔ ہمیں دادا دھمال نے سب بتا دیا ہے۔

صرف اڑتالیس روپے میں فلم کمپنی کھل سکتی ہے۔

صرف اڑتالیس روپے میں؟ مہاراج آپ کی عقل کو کیا ہوا ہے؟

ہم کوئی گدھے نہیں ہیں سیٹھ! ہم سب سمجھتے ہیں۔ دلدا دھمال نے ہمیں سب سمجھا دیا ہے۔ وہ کہتا تھا۔ مجھے صرف اڑتالیس روپے دے دو۔ میں تمہیں فلم کمپنی کھڑی کر کے دکھا دوں گا۔ میں نے اُسے سو روپیہ دے دیا ہے اب وہ کل تک فلم کمپنی کھڑی کر کے میرے پاس آئے گا۔

فلم کمپنی نہ ہوئی بانس کا ڈنڈا ہو گیا۔ اُٹھایا اور کھڑا کر دیا سیٹھ بھوڑی مل نے شدید بیزاری کے عالم میں کہا۔

تم نہیں سمجھتے ہو۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ دادا دھمال نے ہمیں سب سمجھا دیا ہے۔ اور پھر ہمارے پاس سے جائے گا کیا؟ صرف اڑتالیس روپے۔ اور اڑتالیس روپے پر اگر اڑتالیس لاکھ کا منافع ہو تو کیا تم اُس کو جُوا دھندا کہو گے؟ مگر آئے گا کہاں سے؟

ہم سب جانتے ہیں۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ تم کو بھی سمجھا دیں گے۔ تم کو بھی بتا دیں گے۔ کل دادا دھمال ہمارے پاس آئے گا۔ اُس سے مل کر اپنی تسلی کر لینا!

دوسرے دن دادا دھمال اپنے بزنس منیجر منگھن کو لے کر ہمارے گھر آگیا۔ منگھن دادا دھمال سے بھی سوکھا اور پتلا نظر آتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں بڑی تیزی سے ادھر اُدھر حرکت کرتی تھیں۔ اور اُن میں ایک مستقل بھوک سی چمکتی رہتی۔ بڑی ذہین اور طرار آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھیں جو نگاہوں سے اُنگلیوں کا کام لیتی معلوم ہوتی تھیں۔

جب سیٹھ کھسوٹی مل نے پوچھا۔ اڑتالیس روپے میں بکھر کیسے بن سکتی ہے۔ اور اس سے اڑتالیس لاکھ کا فائدہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو دادا دھمال نے ایک

پیکٹ کھولا۔

" یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

یہ آپ کی فلم کمپنی کے لیٹر پیڈ۔ اگریمنٹ فارم اور رسیدیں ہیں۔ میرے بزنس منیجر سمّن نے انھیں راتوں رات پریس میں دے کر چھپوا لیا ہے۔

دو سو روپے تو شاید انھیں کاغذوں کے ہو جائیں گے۔ اسیٹھ بھوگی مل نے اعتراض کیا۔

اپنی جیب سے ایک دھیلہ نہیں جائے گا۔ سمّن نے بتایا۔ میں نے پریس والے سے کنٹریکٹ کر لیا ہے۔ کہ ہماری پکچر کی پوری پبلسٹی اس کے ہاں چھپے گی۔ بڑے بڑے رنگین پوسٹر بھی وہ خود شائع کرے گا۔ پچیس ہزار روپے خرچ ہوں گے!

مگر تم تو اڑتالیس روپے .... میں نے کہنا چاہا۔ مگر مجھے سمّن نے بیچ میں ہی ٹوک کر کہا " پہلے پوری بات سن لو سیٹھ۔ پھر اعتراض کرو۔ وہ پچیس ہزار روپے ہمیں نہیں دینا ہوگا۔ اپنی جیب سے ایک دھیلہ نہیں جائے گا۔ یہ رقم ڈسٹری بیوٹر دے گا۔

یہ ڈسٹری بیوٹر کون ہوتا ہے؟ میں نے پوچھا۔

تمھاری طرح سیٹھ لوگ ہوتا ہے بھوّن بولا۔جو پکچر ہم سے خریدتا ہے۔وہی پچیس ہزار دے کر پبلسٹی کی ڈیلوری لے لیگا۔

"مگر مال کے بغیر پکچر کیسے بن جائے گی؟ سیٹھ بھسوڑسن مل نے پوچھا۔

"پکچر میں تو بڑے بڑے سٹار لوگ کام کرتے ہیں۔جو سُنا ہے ایک پکچر میں کام کرنے کے لیے لاکھوں روپے وصول کر لیتے ہیں۔تم اڑتالیس روپے میں پکچر کیسے بناؤ گے؟"

بہت آسان کام ہے۔دادا دھمال بولا۔اشونی کمار میرا بچپن کا دوست ہے۔وہ مجھے دادا دھمال کہتا ہے۔میں اُسے دادا گنّی کہتا ہوں۔ کل رات کو میں اشونی کمار سے ملا تھا۔میں نے کہا۔دادا گنّی۔میری پکچر میں کام کرے گا؟ وہ بولا۔دادا دھمال میرے پاس اس وقت بیس پکچریں ایک تمھاری اور ہو جائے گی تو کیا حرج ہو جائے گا۔میں نے کہا مگر میں پہلے دس دن تک ایک پیسہ نہیں دوں گا۔اور دوسروں سے کم بھی دوں گا تو میرے بچپن کا دوست ہے۔تو اگر ایک پائی بھی نہ دے تو پروا نہیں۔ میں دوسروں سے ڈھائی لاکھ لیتا ہوں تجھ سے دو لاکھ لوں گا۔میں نے کہا میں پورے دو لاکھ سے ایک پائی زیادہ نہ دوں گا۔وہ بولا تجھے یاری کی یاری کام ہے۔اُس کے روپے سے کیا کام؟ بس سودا ہو گیا۔

درنگر؟" میں نے کہا۔

سمن فوراً بولا۔" اور میں برجندر کمار کے پاس گیا تھا۔کسی زمانے میں ہم دونوں ایک ہی ڈائرکٹر کے اسسٹنٹ تھے۔ہم دونوں نے اکٹھے مصیبتیں جھیلیں اور دکھ جھیلے۔بھگوان نے آج برجندر کمار کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔مگر شاباش ہے اُس انسان کو۔وہ آج اپنے دوستوں کو نہیں بھولا۔جب میں نے برجندر کمار سے آپ کی پکچر میں کام کرنے کے لیے کہا۔تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ میرا ہاتھ دبا کر بولا۔کتے تیری پکچر میں کام کیسے نہیں کرونگا۔

"اُس نے تمھیں کتا کہا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

سمن بولا۔وہ مجھے پیار سے کتا کہتا ہے۔کیونکہ میں اپنے دوستوں کا بے حد وفادار ہوں۔اور میں اُسے چنّی کہتا ہوں۔میں نے کہا۔چنّی۔تجھے پہلے اس دن ایڈوانس لیے بغیر کام کرنا ہوگا۔اور پیسے بھی دوسروں سے کم دونگا۔وہ بولا۔کتے۔پیسے کی بات مت کر مجھ سے۔دوسروں سے چار لاکھ لیتا ہوں۔تو ایک کھوٹا پیسہ بھی دے گا۔تو لے لوں گا۔بس میں اُسے دو لاکھ پر راضی کر کے آگیا۔

دو لاکھ زیادہ دیئے تم نے۔پونے دو کیے ہوتے! دادا دھمال نے

اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ورنہ اشوفی کمار خفا ہو جائے گا۔

تو پونے دو کرا دونگا۔ جتنی تو اپنی مٹھی میں ہے!

پونے دو اور پونے دو ساڑھے تین لاکھ تو یہ ہو گئے اور تم اڑتالیس روپے بتا تے تھے۔ یہ رقم کون دے گا۔

سیٹھ دس دن میں تو میں پکچر کی ایک تہائی ختم کر دونگا۔ واداونعال بولا۔ پھر ڈسٹری بیوٹرز کو پکچر دکھا کسان سے پیسے لے لینگے۔ ایک ٹریٹوری سے ایک لاکھ کی پہلی قسط آئیگی۔ چھ ٹکیوں سے چھ لاکھ گھر بیٹھے آجائیں گے۔ ادھر سے چیک آئے گا۔ اُدھر دے دیا جائیگا۔

اپنی جیب سے ایک دھیلہ نہیں جائیگا۔ یمن بولا۔

یہ پکچر جانی بھائی کے سٹوڈیو میں بنے گی۔ وہی سیٹ بنائے گا۔ فرنیچر اور کپڑے دے گا۔ اُسی کی کنیکشن سے جائے آئے گی۔ اُسی کی لیبارٹری میں پکچر دُھلے گی۔ اور تیار ہو گی۔ اس سارے خرچے کا وہی ذمے دار ہو گا۔

وہ کیوں ذمے دار ہو گا؟ سیٹھ بھسوڑی لل نے پوچھا۔

کیونکہ ہم پکچر کے ختم ہونے پر اُسے دو لاکھ روپے دیں گے۔

دو لاکھ ہم کہاں سے دیں گے؟ میں نے پوچھا۔

تم نہیں دوگے سیٹھ۔ وہ ڈسٹری بیوٹر دیگا۔ جو پکچر اُٹھائے گا وہی یہ رقم دیگا۔

اپنی جیب سے ایک دھیلہ نہیں جائے گا۔

اور ہیرو مُن ؟ سیٹھ بھوڑی مل نے پوچھا۔

اُس کا بھی بند و بست ہو گیا ہے۔ دادا بھال بولا میں پریم بالا سے بات کر کے آرہا ہوں۔ پریم بالا کو میں نے سب سے پہلے اپنی پکچر میں چانس دیا تھا۔ جب سے وہ میری احسان مند ہے۔ وہ بیچاری بھی دس دن تک ایک پیسہ نہیں لے گی۔

سیٹھ بھوڑی مل نے کہا۔ جب سب لوگ مفت کام کر رہے ہیں۔ تو پھر اڑتالیس روپیوں کی کیا ضرورت ہے ؟

سیٹھ مہورت کے لیے پیڑے آئیں گے! میں نے حساب لگالیا ہے۔ اڑتالیس روپے کے پیڑے آئیں گے!

دیسے میں تو آیا۔ حلوائی کو جانتا ہوں پشمن بولا۔ جو اُدھار پر پیڑے بھی دے دیگا۔

"نہیں، نہیں! میں نے جلدی سے کہا "حلوائی سے اُدھار کرنا ٹھیک نہیں ہے اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں ہم"

مگر کمپنی کے لیے ایک آفس تو بنانا پڑیگا۔ اس کیلئے ایک کلرک ٹائپسٹ وغیرہ رکھنا پڑے گا۔ ٹائپ رائٹر آئے گا! سیٹھ بھوڑی مل نے کہا۔

سیٹھ کمپنی کا آفس ہم آپکے آفس میں رکھیں گے! پشمن بولا۔ ایسا ہم نے سوچا تھا۔ اب اتنا سا ہمارا کام تو آپ بھی کر دیں گے۔ رہا ٹائپسٹ اور اکاؤنٹنٹ۔ تو

ا خود حساب کتاب کر لیتا ہوں۔ ٹائپ بھی جانتا ہوں۔ خواہ مخواہ پیسے برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

" یہ سب کام سمن کر لیگا" دادا دھمال بولا۔ اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائیگا۔

سیٹھ بھسوڑی مل میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اُس کی طرف۔ سچ بات تو یہ تھی۔

ہم دونوں کو اُنھوں نے قائل کر لیا تھا۔ واقعی پکچر پر اڑتالیس ہزار روپے سے زیادہ خرچ نہیں آسکتا تھا۔

مگر اڑتالیس لاکھ کہاں سے آئے گا؟

سیٹھ پکچر ٹیکنی کلر میں اور WIDE SCREEN کی تیار ہوگی۔ ایسی غضب پکچر بناؤنگا کہ لوگ سیسل بی ڈی مِل کو بھول جائیں گے۔ فلم ناگن نے تین کروڑ روپے بزنس کیا ہے۔ مغلِ اعظم اب تک چھبیس کروڑ کا بزنس کر چکی ہے۔ کیا ہماری مت میں اڑتالیس لاکھ بھی نہ آئے گا!

اور اگر کم بھی آئیگا تو کیا ہوا؟ سمن بولا۔ اپنی جیب سے تو ایک دھیلا نہیں جائیگا۔

فلم کمپنی کا نام کیا رکھا ہے؟ میں نے لیٹر پیڈ کھولتے ہوئے پوچھا۔

ڈھنگی لا پروڈکشن! سمن بولا۔

ڈھنکیلا پروڈکشن!! دادا دھمال بولا۔

دونوں خوش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں مسرت سے جھوم جھوم گیا کیونکہ لیٹر پیڈ پر ڈھنکیلا پروڈکشن جلی حروف میں لکھا ہوا تھا اور اُن کے اُوپر ایک گدھے کی تصویر تھی!

دادا دھمالی نے اس تصویر کی طرف اشارہ کرکے کہا سیٹھ یہ ہماری کمپنی کا موزوگرام ہوگا۔ اور پکچر میں بھی سب سے پہلے یہی تصویر آئے گی۔ بس اب منہ میٹھا کراؤ۔ اور مہورت طے کردو۔

ٹھیک اڑتالیس روپے میں پکچر کا مہورت ہوگیا۔

مگر اس کے بعد تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی۔ مہورت پر کچھ لوگوں نے کوکا کولا مانگ لیا۔ اور اس کے لیے کوکا کولا کی ایک گاڑی منگانا پڑی۔ پھر پان اور سگریٹ کے خرچ کا تو ہم نے سوچا نہ تھا۔ مہورت لگانے والے جوتشی نے بھی روپے مانگ لیے پھر ادھر ادھر جانے پر ٹیکسی بھاڑے پر بہت خرچ اٹھتا تھا۔ اس لیے ہم لوگوں نے ایک گاڑی ایک سٹیشن ویگن خرید لی۔ گاڑی بھی نئی خریدنا پڑی۔ کیونکہ دادا دھمالی نے بتایا کہ یہ تو شو بزنس ہے۔ یہ سب تو شو کا کام ہے۔ سیکنڈ ہینڈ گاڑی دیکھ کر ڈسٹری بیوٹر کم دام دے گا۔ نئے ماڈل کی بڑی گاڑی دیکھ کر بھاؤ زیادہ بتائے گا ویسے ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے اس سلسلے میں۔ گاڑی تو آپ ایسے بڑے سیٹھ کو رکھنا ہی چاہیے۔ اس گاڑی کو ہم پکچر کے لیے بھی استعمال کرلیں گے۔ ڈنبلا پروڈکشن کا ایک سٹیشن ویگن بھی ہوگا۔ تو شو اور بڑھ جائے گی۔ ادھر پھر کونسا اپنے گرہ سے مال خرچ کرنا ہے ہمیں۔ دس دن کے بعد ڈسٹری بیوٹر سے پیسہ آنے والا

ہے۔ چھ لاکھ آئے گا۔ اس میں اپنی گاڑی اور سٹیشن ویگن اور ڈرائیور کا خرچہ بھی نکال لیا جائے گا۔

اپنی جیب سے ایک دھیلہ نہیں جائے گا! سمن بولا۔

صورت تو واقعی اڑتالیس روپے میں ہو گیا تھا۔ مگر جب سٹیشن ویگن اور موٹر گاڑی اور دوسرے اِدھر اُدھر کے خرچ ملا کر حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اب تک پکچر پر چھیالیس اڑتالیس ہزار خرچ ہو چکا ہے۔

اور ابھی صرف مہورت ہوا تھا۔

میں نے پکچر بند کر دینے کا سوچا۔ مگر سیٹھ بصوڑی مل نے مجھے سمجھایا۔ اتنے دنوں میں غور سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ دادا دھمال اور سمن شریف اور دیانت دار دکھائی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کو بزنس کا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو آپ کی فلم کمپنی کا بزنس بھی سنبھال لوں۔

اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے خوش ہو کر کہا۔ اور سیٹھ بصوڑی مل ان کی خدمات کے پہلے ہی چار آنے کی پارٹنر شپ بھی دے دی۔

اس کی کیا ضرورت ہے؟ سیٹھ نے کہا۔

نہیں جناب! میں کسی کا حق مارنے کے حق میں نہیں ہوں۔ جو آدمی محنت کرتا ہے۔ اُسے اُس کا صلہ جلد یا بدیر ملنا چاہیئے۔ اور پھر میرا اس میں کیا نقصان ہے۔

ڈسٹری بیوٹر سے پیسہ آنے لگا۔ اور سب کو بانٹا جائے گا۔ اپنی جیب ایک د
نہیں جائے گا!

مہورت کے چند دن بعد کہانی پر بحث شروع ہوئی۔
پکچر کی کہانی کیا ہوگی؟ میں نے پوچھا۔
کہانی؟ دادا دھمال گڑبڑا کر بولا۔
کیا پکچر میں کہانی نہیں ہوتی ہے؟ میں نے پوچھا۔
کبھی کبھی ہوتی ہے! سمن نے اقرار کیا۔
پھر اس پکچر کی کہانی کیا ہے؟ میں نے اصرار کرکے پوچھا۔
سمن نے سوچ سوچ کر ایک انگلی اٹھائی۔ دادا دھمال نے پورا ہاتھ
اپنے دوسرے ہاتھ پر اس زور سے مارا کہ میں حیرت سے اچھل پڑا۔
کوئی مچھر تھا؟ میں نے پوچھا۔
نہیں۔ کہانی!
کہانی؟
ہاں غضب کی فرسٹ کلاس، عظیم الشان ریکارڈ توڑ کہانی۔ ابھی ابھی ذ
آئی ہے۔

کیا کہانی ہے ؟ میں نے پوچھا۔

سوہنی مہینوال ۔

سوہنی مہینوال ؟ میں نے کہا۔ سوہنی مہینوال تو بن چکی ہے۔ میں نے سُنا تھا۔

اجی ایک بار نہیں ۔ تین بار بن چکی ہے سیمن نے جواب دیا۔ اور دو بار سلور جوبلی منا چکی ہے۔ ایسا غضب کا سبجیکٹ سوچا ہے دادا ۔ داد دیتا ہوں سوہنی مہینوال !

اور وہ بھی ٹیکنی کلر میں ! دادا دھمال بولا ۔

اور وہ بھی WIDE SCREEN پر ! سمن نے لقمہ دیا۔

اور میں اس میں ایک بڑی تبدیلی کرنے والا ہوں ۔ میں اس میں ایک آئیڈیا لگاتا ہوں جس سے یہ کہانی سلور جوبلی منانے پر گولڈن جوبلی منانے پر ڈائمنڈ جوبلی منانے پر بھی پکچر ہاؤس سے نہ ہٹے ۔ اجی جناب ! اس تصویر کو تو اب پولیس ہی سینما سے اُٹھائے گی !

وہ کیا تبدیلی ہے ؟ سمن نے عقیدتمند نگاہوں سے دادا دھمال کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

سُنو ۔ دادا بولا ۔ اشونی کمار ایک کمہار ہے ۔ پریم بالا اُس کی بیٹی ہے جس کا نام سوہنی ہے ۔ سوہنی پر بر جندر کمار عاشق ہوتا ہے جس کا نام مہینوال ہے سمجھ گئے !

ہاں سمجھ گئے ۔ میں نے کہا۔

اب میں اس میں ایک آئیڈیا لگاتا ہوں۔

کیا ؟

کمہار کا گدھا !

کمہار کا گدھا ؟ شمن نے حیرت سے پوچھا۔

دھمال دادا نے چہک کر کہا ہر کمہار کے ہاں ایک گدھا نہیں ہوتا ہے
اب یہ گدھا ہماری کہانی میں بھی موجود ہے ۔ سوہنی مہینوال کی کہانی میں بھی کمہار
کا ایک گدھا ہے ۔ مگر افسانہ نگار نے اس گدھے سے کوئی کام نہیں لیا ہے۔
میں اس کمہار کے گدھے سے پکچر میں وہ کام لوں گا وہ کام لوں گا کہ لوگ
سوہنی مہینوال کو بھول جائیں گے ۔

وہ کیسے ؟

مثال کے طور پر جب سوہنی کو مہینوال سے عشق ہو جاتا ہے ۔ تو وہ اس
گدھے کے گلے میں بانہیں ڈال کے روتی ہے ۔ اُسے اپنے عشق کا ہمراز بناتی
ہے ۔ بے چارا بے زبان گدھا سب سنتا ہے ۔ سب سمجھتا ہے ۔ مگر کچھ کہہ نہیں
سکتا ۔ پریم بالا اپنے محبوب کے فراق میں ایک گیت گاتی ہے ۔ اور ٹپ ٹپ
اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں ۔

کس کی آنکھوں سے ؟ پریم بالا کی ؟

نہیں گدھے کی ۔ وہ بے زبان آنکھیں ۔ مگر ہمدردی اور درد اور محبت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی ۔ ایک بے زبان جانور کی آنکھیں جب آنسو برسائیں گی تو ہال میں کون ایسا مرد ہوگا جو رو نہ دے ۔

سمن رونے لگا ۔

اب ایک اور آئیڈیا لگاتا ہوں !

لگائیے ! سمن نے روتے روتے کہا ۔

گدھے کو سوہنی سے ہمدردی ہو جاتی ہے ۔ وہ اُسے اپنی پیٹھ پر سوار کر کے چل دیتا ہے ۔ مہینوال سے ملانے کے لیے ۔ راستے میں ایک خندق آتی ہے وہ اُسے چھلانگ مار کے پار کر جاتا ہے ۔ پھر ایک دیوار آتی ہے وہ اُسے بھی پھلانگ جاتا ہے ۔ پھر دریائے چناب آجاتا ہے ۔ سوہنی اِدھر، مہینوال اُدھر ۔

بیچ میں گدھا ؟ میں نے پوچھا ۔

نہیں جناب ! اب کیا ہو ۔ دریا کی روانی زوروں پر ہے ۔ لہروں کی ہیجانی طوفانی ہے ۔ اب کیا ہو ؟ بھگوان کا نام لے کر گدھا دریا میں کود پڑتا ہے ۔ اور لہروں کو چیرتا ہوا دوسرے کنارے تک پہنچ کر سوہنی کو مہینوال سے ملا دیتا ہے ۔ تالیاں ۔ پھر زور تالیاں !

پھر کیا ہوتا ہے؟ میں نے آگے جھک کر کہا۔ جبکہ کہانی میں ہمدیہ دلچسپی پیدا ہو چکی تھی
پھر جناب یہ ہوتا ہے۔ کہ کمہار کو پتہ چل جاتا ہے۔ کہ سوہنی گدھے پر سوار ہو کر
ہر روز رات کو مہینوال سے ملنے جاتی ہے۔ اس پر غصے میں آکر وہ سوہنی کو ایک
کمرے میں بند کر دیتا ہے۔ اور گدھے کو ڈنڈے مار مار کر ادھ موا کر دیتا ہے۔ ذرا
سین ملاحظہ فرمائیے۔ اندر کمرے میں پریم بالا رو رہی ہے۔ باہر گدھا مار کھا رہا ہے۔
مار کھاتے کھاتے گدھا بیہوش ہو جاتا ہے۔ کمہار اُسے وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔
اور سوہنی کے کمرے کے باہر دروازے پر کنڈی لگا جاتا ہے۔

اب دیکھئے میرا آئیڈیا۔ رات ہے۔ گدھا بیہوش ہے۔ سوہنی کمرے میں بند ہے۔
جناب کے یار مہینوال انتظار کر رہا ہے۔ سوہنی غصے میں آکر دروازہ پیٹتی ہے۔
مگر کوئی دروازہ نہیں کھولتا۔ دروازہ پیٹنے کی آواز سن کر گدھے کو ہوش آجاتا ہے
وہ سب سمجھ جاتا ہے۔ مگر کیا کرے کیا نہ کرے۔ بے زبان جانور۔ اور زخمی۔ خیر
کسی نہ کسی طرح سے گھسٹ گھسٹ کر کمرے کی طرف بڑھتا ہے۔ دروازے پر
پہنچ کر اپنی لمبی گردن اونچی کر کے اپنی تھوتھنی مار مار کر باہر سے کنڈی کھولنے
میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ سوہنی برآمد ہوتی ہے۔ اور اُچک کر
گدھے کی پیٹھ پر بیٹھتی ہے۔ گدھا زخمی ہے۔ اُس سے چلا نہیں جاتا۔ مگر مالکن
کی ہمدردی میں تیر کی طرح اُڑا جاتا ہے۔ اور جناب کا پاٹ تیر کر سوہنی کو مہینوال

کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ تالیاں!!

ہم لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے!

اب کمہار کو بہت غصہ آتا ہے۔ اور وہ اپنے گدھے کو کسی دوسرے کمہار کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ جو کسی دوسرے گاؤں میں رہتا ہے۔ دن بھر سوہنی گدھے کو ڈھونڈتی ہے۔ رات کو ادھر چناب کے کنارے مہینوال سوہنی کا انتظار کرتے ہوئے گاتا ہے۔

"آجا آجا میڈی سوہنی!"

سوہنی گدھے کو تلاش کرتے ہوئے گاتی ہے!

"آجا آجا میڈے گدھے!"

ڈوئیٹ ختم ہونے پر گدھا دوسرے مالک کے گھر سے رسیاں تڑا کر پھر عین وقت پر پہنچ جاتا ہے۔ تالیاں!

مگر سوہنی مہینوال تو ایک ٹریجڈی ہے۔ میں نے کہا۔

ہاں ٹریجڈی تو ہے۔ داد الوالہ۔ آخری دن یہ ہوتا ہے کہ کمہار گدھے کو بند کر کے باہر سے تالا لگا دیتا ہے۔ اب سوہنی چناب کے پار کیسے جائے گی۔ مگر وہ ایک کچا گھڑا لے کر چل دیتی ہے۔ ادھر گدھا دیوار سے ٹکریں مار مار کر دیوار توڑ دیتا ہے۔ (گاؤں میں تو کچی مٹی کی دیواریں ہوتی ہیں نا) اور باہر نکل کر

سوہنی کو ڈھونڈتا ہے۔ اتنے میں وہ چھپ کر سُن لیتا ہے کہ سوہنی ایک کچے گھڑے کو لے کر چناب پار کرنے گئی ہے۔ وہ سب کی نظر بچا کر دریا کی طرف بھاگتا ہے۔ مگر کمار کو پتہ چل جاتا ہے۔ وہ بندوق اٹھا کر گدھے کو گولی مار دیتا ہے۔ مگر گدھا بے زبان بے چارہ ظلوم زماوار گدھا گولی کھا کر سخت زخمی ہو جاتا ہے۔ مگر دریا کی طرف دوڑتا جاتا ہے۔ اُدھر دریا کے اُس پار مہینوال سوہنی کا انتظار کر رہا ہے۔ اور کہتا ہے۔ سوہنی بغل میں کچا گھڑا دبائے دوڑتی جا رہی ہے۔ پیچھے پیچھے سے گدھا بھاگا چلا آ رہا ہے۔ تاکہ مالکن کو کچے گھڑے پر سوار ہو کر چناب عبور کرنے سے روک دے۔ آج بادل گھِر کر آئے ہیں۔ طوفان گرج رہا ہے۔ چناب ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

مہینوال چلاتا ہے۔ سوہنی! سوہنی! کیا تو بھی بے وفا نکلی؟

سوہنی چلا کر کہتی ہے۔ میں کیسے بیوفائی کرونگی۔ میرا رشتہ الفت تو بالکل پکا ہے مگر گھڑا تو کچا ہے! گدھا سوچتا ہے۔ اور اپنے جسم کی آخری قوت استعمال کرتے ہوئے دریا کی طرف بھاگتا جاتا ہے۔ مگر سوہنی اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ زخمی گدھا کنارے پر گر جاتا ہے سوہنی کچے گھڑے کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ مہینوال اُسے بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ مگر پانی کی خوفناک لہروں میں دونوں محبت کے مارے

ڈوب جاتے ہیں۔ گدھا بھی اک آخری ہچکی لے کر دم توڑ دیتا ہے۔

کہانی ختم کرکے دادا دھمال اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھنے لگا
سیٹھ بھسوڑی مل نے کہا۔ مجھے تو یہ سوہنی مہینوال کی کہانی کم اور گدھے کی زیادہ معلوم ہوتی ہے!——
"مگر کس غضب کی کہانی ہے۔ سچ کہتا ہوں سیٹھ میرے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے!" میں نے اقرار کیا۔
سوال یہ ہے بھیمن بولا۔ ایسا اچھا کام کرنے والا گدھا کہاں سے ملے گا؟
دادا دھمال نے کہا کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ گدھا تو سامنے بیٹھا ہے!

میں؟——میں نے حیرت سے پوچھا۔
ہاں سیٹھ! دادا دھمال نے بڑی لجاجت سے کہا۔ اگر تم میری کہانی میں کام کرو۔ تو میری تقدیر سنور جائے گی!
مگر میں تو ایک گدھا ہوں۔ کیا اتنے بڑے بڑے فلم سٹار ایک گدھے کے ساتھ کام کرنا پسند کریں گے؟
وہ دن رات اور کرتے کیا ہیں؟ بھیمن بولا۔ آپ ہاں جانیے اُن کو منانا میرا کام ہے!

مگر میں نے آج تک ایکٹنگ نہیں کی ہیں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اور یہ رول تو بہت بڑا ہے۔ اس کہانی میں تو گدھا تقریباً ایک ہیرو ہے۔

شروع میں ہر ہیرو گدھا ہوتا ہے! گمن بولا۔ تین چار پکچریں چوپٹ کرنے کے بعد کہیں اُسے عقل آتی ہے۔ مگر آپ کوئی ایسے ویسے معمولی گدھے نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے گدھے ہیں۔ پھر بے حد حساس اور فیک ڈل گدھے ہیں۔ آپ کے لیے ایکٹنگ کرنا کیا مشکل ہے۔

ارے مالک! دادا دھمال نے سمجھایا۔ آپ تو دو چار دن میں ایسے طاق ہو جائیں گے کہ بڑے سے بڑے ہیرو کا ناک کاٹنے لگیں گے۔ رول تو وہ دھا تو ہے کہ پکچر ختم ہونے سے پہلے ایک ایک لاکھ کرکے دس کانٹریکٹ آپ کی جیب میں ہوں گے۔

وہ کیسے۔ میں کوئی فلم سٹار ہوں؟ میں نے پوچھا۔

اجی دھڑتے کی پبلسٹی ہو تو گدھا بھی فلم سٹار بن سکتا ہے۔ آج کل کا زمانہ ہی پبلسٹی کا ہے۔ آپ کام کیجئے۔ اور اپنی پبلسٹی کے لیے دو لاکھ روپیہ منظور کیجئے۔ پھر دیکھئے۔ کیسا رنگ جماتا ہوں گمن بولا۔

مجھے منظور ہے! میں بے دھڑک ہو کر بولا۔

پہلے دن کے رش پرنٹ دیکھ کر فلم شار پریم بالا میرے گلے سے لگ گئی۔
لی! کیا غضب کے EXPRESSIONS دیئے ہیں تم نے! دلیپ کمار کو مات کر دیا۔"
واقعی؟ میں نے بے حد خوش ہو کر پوچھا۔
اور وہ دریا کے کنارے تمہارا لڑکھڑا کے چلنا جب بینوائی تجھ سے ملنے کیلئے
گئے تھے۔ اُس سین میں تم نے کمال ہی کر دیا۔ بالکل چارلی چپلن کی سی اداکاری ہے!
نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کمزور لہجے میں احتجاج کیا۔ مگر میرا دل
اندر ہی اندر بلیوں اچھل رہا تھا۔

سچ کہتی ہوں۔ اور وہ ــــ تمہارا وہ کلوز اپ کس قیامت کا ہے جس میں کبھار کی نظر بچا کر تیزی سے میرے پاس آجاتے ہو۔ اور مجھے اپنی پیٹھ پر سوار کر لیتے ہو۔ بالکل دیو آنند کی سی شوخی ہے تم میں! ــــ مجھے معلوم نہیں تھا ہز گدھے کی کھال کے اندر اتنا بڑا اداکار چھپا بیٹھا ہے۔

پھر وہ عجیب طرح سے ہنس کر کہنے لگی۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ فلم کے ختم ہوتے ہوتے میں ہینوال کی بجائے تم سے عشق کرنے لگوں!

اتنا کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ اپنی جسارت پر کچھ شرمائی بھی پھر اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ اور دوسرے ہی پل باکرشمہ پھیر لیا۔ میں بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گیا۔ جیسے یہ سب ایک دلچسپ مذاق تھا۔ مگر اس کی عجیب عجیب نگاہیں دیکھ کر میرا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔

اسی شام اتفاق سے وہ ہمارے گھر آگئی۔ بہت پریشان اور اداس معلوم ہوتی تھی۔ جب میں نے دریافت کیا۔ تو صاف مکر گئی کہ کوئی بات نہیں لیکن جب میرا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ تو بولی۔ کیا بتاؤں ڈارلنگ۔ بابو میرا ابا کیس ہے انکم ٹیکس کا۔ اس کے حساب میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ اور مجھے انکم ٹیکس نے دو لاکھ کا جرمانہ کر دیا ہے۔ کل وہ جرمانہ بھرنا ہے۔ اور میرے بینک میں

وقت صرف پچاس ہزار روپے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟

میں نے کہا۔ تو اس میں کیا بات ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کا چیک میں دے دیتا ہوں۔

ناں۔ وہ سر ہلا کر بولی۔ تم سے میں نہ لوں گی۔ میں نے دس دن تک تمہاری پکچر میں فری کام کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں ہرگز ہرگز تم سے یہ رقم نہ لوں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا ناں کہ میں جیل چلی جاؤں گی مگر میں اپنے وعدے سے نہیں پھروں گی۔

ہمارے ہوتے ہوئے تم جیل جاؤ گی؟ میں نے دلیرانہ لہجے میں کہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈیڑھ لاکھ کا چیک تو تمھیں لینا ہی پڑے گا۔

وہ انکار کرتی رہی۔ میں اصرار کرتا رہا۔ آخر میرے شدید اصرار پر وہ مان گئی۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ یہ رقم ایک ماہ کے اندر مجھے لوٹا دے گی۔ میں مان گیا اس پر اس نے چیک لے لیا۔

پھر میں نے تھوڑی سی وہسکی پی لی۔ اور اس نے تھوڑی سی شیری پی پھر کچھ دیر تک میرے ریڈیو گرام پر ریکارڈ بجاتی رہی۔ پھر بولی۔

تمھیں ناچنا آتا ہے؟

میں نے ہنس کر کہا۔ خاکسار تو صرف دولتی جھاڑ سکتا ہے!

گنوار مت بنو۔ وہ مجھے ڈانٹ کر بولی۔ یہ تم نے اپنی کیا صورت بنا رکھی ہے۔

ہر وقت گلے میں ایک جھولا ڈالے گھومتے ہو۔ کوٹ پتلون پہنا کرو اور ٹائی لگایا
کرو۔ آؤ تمھیں ڈانس سکھاؤں۔ عمدہ حلقوں میں اُٹھنے بیٹھنے کے لیے مغربی ڈانس
سے واقفیت ضروری ہے !

یہ کہہ کر اس نے سلو فاکس ٹراٹ کا ایک ریکارڈ لگا دیا۔ اور غالیچے کے فرش
پر مجھے ڈانس سکھانے لگی۔ ون — ٹو — تھری......
وہ تال دے کر چٹکی بجاتی تھی اور میں ناچتا جاتا تھا۔ وقت کیسے گزر گیا۔
اس کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میں ایک گدھا ہوں۔ اُن لمحوں
میں میں نے اپنے آپ کو ایک انسان کی طرح محسوس کیا تھا۔ خوب صورت کشادہ کمرہ
دبیز غالیچہ ریڈیو گرام بجتا ہوا نیلی نیلی مدھم مدھم جھلملاتی ہوئی روشنیاں۔ اور
ایک حسین پیلا گلابی چہرہ مسرتوں کی کرنیں برساتا ہوا۔ یہ ہے زندگی؟ اور
اس زندگی سے اس دُنیا کے کروڑوں گدھے کتنے دُور ہیں !

کیونکہ پریم بالا نے چونک کر اپنی گھڑی دیکھی اور گھبرا کر بولی۔ اُف نو بج
گئے۔ گھر پر یاں بھی انتظار کرتی ہوں گی۔ اب میں جاتی ہوں کل سٹوڈیو میں ملیں گے
ٹاٹا۔ وہ جلدی سے میرے کان پر چٹکی۔ ایک بوسہ دیا اور گھوم کر تیزی سے باہر چلی گئی
انہی دس دنوں کی شوٹنگ میں ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ کمہار کی گلی کا
سیٹ لگا ہوا تھا۔ برتن چاک پر گھمائے جا رہے تھے۔ کمہار اور کمہارین اپنے اپنے

ہیں مصروف ۔ پتے کھیلتے ہوئے، ادھر ادھر ٹہل رہے تھے ۔ دائیکس میں کبھی
یان کھاتے ہوئے کبھی گنگناتے ہوئے ۔ عجب گہما گہمی کا منظر پیش کر رہے تھے ۔
ایک طرف درختوں کا جھنڈ لگایا گیا تھا ۔ اس کے نیچے کئی گدھے گھاس
ر مار رہے تھے ۔

میں نے دادا دھمال سے پوچھا ۔ ان گدھوں کو کیوں بلایا ہے ؟
وہ بولا ۔ کمہاروں کی گلی کا سین ہے ۔ اور اس میں گدھے نہ ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔
میں ان گدھوں کے ساتھ کام نہ کروں گا ۔ میں نے غصّے سے چلا کر کہا ۔
نہیں سیٹھ ۔ یہ تو ایکسٹرا گدھے ہیں ۔ بھلا اُن کا آپ کا کیا مقابلہ ؟ یہ تو سین
بھا بڑھانے کے لیے منگائے گئے ہیں ۔ اُن کو تو گدھا کہنا بھی لفظ گدھے کی توہین
ہے ۔ آپ تو گدھے ہیں سیٹھ ۔ مگر یہ تو بازاری آوارہ ٹٹو ہیں ۔
ماں آپ ایسا گدھا ۔ کہاں یہ ٹٹو ۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی ۔ اہمّن
سے بولا ۔ آپ کا کام تو صرف بڑے بڑے فلم سٹاروں کے ساتھ ہو گا ۔
کمار کے ساتھ ۔ برجندر کمار کے ساتھ ۔ پریم بالا کے ساتھ ۔
ں یہ ٹھیک ہے ! میں نے اپنا غصّہ دُور کرتے ہوئے کہا ۔
دادا دھمال میرے بالکل قریب آ کر بولا ۔ اب تو میں نے سکرپٹ بالکل
بدل دیا ہے ۔ اب تو تقریباً ہر سین میں جہاں پریم بالا آتی ہے وہاں آپ کا کام

بھی رکھا ہے!

شاباش! میں نے خوش ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور میں اُن گدھوں کے قریب گیا۔ قریب جاتے ہی مَیں نے اُس مغربی گدھی کو پہچان لیا جس سے میں نے زندگی میں پہلی بار جوزف کے جھونپڑے کے باہر اظہارِ عشق کیا تھا۔

مگر اب اُس گدھی کا رنگ اُڑا اُڑا سا تھا۔ گال پچکے ہوئے پیٹ اندر دھنسا ہوا۔ اور پسلیاں؟ ـــ ایک ایک پسلی کھال کے اندر سے نظر آ رہی تھی جیسے صدیوں سے اُس نے پیٹ بھر کے گھاس نہ کھائی ہو۔

مَیں نے اُس کے قریب جا کر کہا اے ماہ لقا۔ نظریں اُٹھا۔ دیکھ کون سامنے کھڑا ہے؟

وہ چونک گئی۔ اُس نے گھوم کر کئی لمحوں تک مجھے گھور کر دیکھا۔ مگر پہچان نہ سکی۔

تم کون ہو؟ وہ پریشان ہو کر بولی۔

میں وہی تمہارا پرانا عاشق ہوں جس کی محبت کو تم نے جوزف کے جھونپڑے کے باہر ٹھکرا دیا تھا۔

اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ وہ حیرت سے میری طرف تکتی گئی۔

رک کر بولی۔ یہاں تم کیا کر رہے ہو! کیا تمہارے ساتھ بھی ٹریکٹر اگر دھوں میں لائے گئے ہو؟

جی نہیں جس فلم کمپنی میں کام کرنے کے لیے آپ کو بلایا گیا ہے میں اُس کا

ڈیوسر ہوں!

فلم پروڈیوسر؟ وہ حیرت سے چیخی۔ ایک گدھا؟

جس گدھے کے پاس چند لاکھ روپیہ ہو۔ وہ فوراً پروڈیوسر بن سکتا ہے۔

ڈیوسر بننے کے لیے کسی دوسری کوالی فکیشن کی ضرورت نہیں ہے۔ میم صاحب

کو وکالت کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر کو ڈاکٹری انجنیئر کو انجنیئری

وڈیوسر کے لیے کسی کوالی فکیشن کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف روپیہ چاہیئے!

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتی گئی۔

تم نے اتنا روپیہ کہاں سے کمایا؟

سٹے سے!

کتنا؟

بتیس لاکھ!

بتیس لاکھ؟ باپ رے! وہ سر سے پاؤں تک مجھے دیکھنے لگی۔ میرے

بارک سکن کا عمدہ کوٹ تھا۔ اور نیچے چار ٹانگوں والی پتلون تھی۔ اور

عمدہ ٹائی۔ میرے بال ملائم اور معطر تھے۔ اُس نے میرے قریب آ کر

مجھے سونگھا۔ اور پھر حسرت بھری آواز میں بولی "کاش میں نے تمہاری محبت
قبول کر لیا ہوتا!"

میں چپ رہا۔

"تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔ پھر میری طرف
بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بولی "کیا تم اب مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟"

"وہ وقت گزر گیا مس صاحبہ" میں نے فخر و غرور سے تن کر کہا "ا
میں قریب تھا۔ آج میں خود ایک بڑا فلم سٹار ہوں بنین فیئر اور نیوز سکر
میرے رنگین فوٹو چھپتے ہیں۔ اب میں اپنے برابر والوں میں شادی کروں گا
تم سے کیوں کروں؟

اتنا کہہ کر میں بڑی شان سے وہاں سے گھوم گیا۔ اور ڈائرکٹر کے پاس
آیا۔ اور اس سے کہا۔

"وہ ایک گدھی ہے۔ اکیسٹرا گدھوں میں سنہری بالوں والی۔ وہ بہت
دنوں کی بھوکی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لیے گھاس کا بندوبست کر
جب تک اس کا کام ہے اُسے گھاس کھلاتے رہو۔

"کوئی پرانی یاد؟" دادا دھمال نے مجھے آنکھ مار کر پوچھا۔

"ہاں۔ مگر بے کار۔ اور بجھی ہوئی سی۔"

شمن بولا شعلہ بجھ جائے تو لاکھ ہو جاتا ہے۔ حسن اڑ جائے تو صرف حسرت
باقی رہ جاتی ہے!

اتنے میں پریم بالا مٹکتی ہوئی میرے قریب آگئی۔
بولی۔ کس گدھی سے باتیں کر رہے تھے؟
کوئی نہیں۔ ایک ایکسٹرا ہے!
مگر وہ ذرا غصّے سے بولی۔ مگر میں نے خود دیکھا تم اُس کے قریب کھڑے
ہو کر بڑی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔
تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ جانی۔ وہ تو ایک ایکسٹرا ہے۔ اُس سے میں
کیوں میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ بس ایسے ہی وہ بیچاری مجھے بڑی بھوکی فاقہ زدہ
معلوم ہوئی۔ اس لیے میں نے حکم دے دیا۔ کہ اسے گھاس داس کھلا دو۔
اُسے بالکل گھاس نہیں ڈالی جائے گی! پریم بالا غصّے سے بھڑک کر بولی۔
وہ اسی وقت سیٹ سے باہر نکالی جائیگی۔ ورنہ میں پکچر میں کام نہیں کرونگی۔
وہ کرسی پر منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اُسے منانے کی بہت کوشش کی۔
مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ لاچار مجھے اُس گدھی کو سیٹ سے باہر نکال
دینے کا حکم دینا پڑا۔
اُس کے جاتے ہی پریم بالا کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ اور وہ لٹک لٹک کر گانے لگی۔

"بیری سوتنیا"
وہ اس وقت اتنی پیاری شوخ اور چنچل معلوم ہو رہی تھی۔ کہ میرا جی چاہتا تھا۔ کہ اُس کے قدموں میں گر کر لوٹ لگاؤں۔

دس دن کے بعد ڈسٹری بیوٹروں سے چھ لاکھ روپے آنے والے تھے۔ مگر نہیں آئے۔ وہ قصہ یہ ہُوا کہ جانی بھائی کی لیبارٹری میں ٹیکنی کلر پرنٹ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ٹیکنی کلر پرنٹ تو صرف لندن میں نکلتے ہیں۔ یا امریکہ میں بہت سوچ بچار کے بعد ٹمن کو پرنٹ نکلوانے کے لیے لندن بھیجا گیا۔ خیال یہ تھا کہ وہ پندرہ بیس روز میں واپس آ جائے گا۔ مگر کچھ ایسی ٹیکنیکل دشواریاں پیش آئیں جنھیں دُور کرنے کے لیے ٹمن کو لندن میں دو ہفتوں کے بجائے چار ہفتے رہنا پڑا۔ اور پھر انھیں ٹیکنیکل مسائل کو سلجھانے کے لیے اُسے لندن سے پیرس اور پیرس سے روم جانا پڑا۔ اور معاملہ ٹلتا گیا۔
شوٹنگ روک دینے سے پریم بالا بہت پریشان ہونے لگی تھی۔ ایک دن اُس نے مجھے مشورہ دیا "تم شوٹنگ کیوں روکے بیٹھے ہو؟ آخر ایک دن پرنٹ یورپ سے بن کر آ ہی جائیں گے۔ ایک دن تمھیں ڈسٹری بیوٹروں کے چھ لاکھ کے چیک بھی مل جائیں گے۔ مگر تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو۔ وقت

کیوں ضائع کر رہے ہو۔ ہمت سے کام لے کر شروع کر دو۔ تمہارے پاس پیسہ نہ ہو تو مجھ سے دو چار دس لاکھ لے لو۔

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اور اُسی وقت کام شروع کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم نے ٹمّی کو روم میں روک دیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ دس دن کی شوٹنگ اور ہو جائے تو اُس کے پرنٹ بھی بنوانے کے لیے یورپ بھیج دیں۔ بدقسمتی سے پہلے دس دنوں کے پرنٹ خراب نکلے۔ اس لیے دس دنوں تک مزید شوٹنگ کرنی پڑی۔ اِس دوران میں سب لوگوں نے تقاضے شروع کر دیئے اور ہمیں وعدے کے مطابق سب کو پیسے دینا پڑے۔ پھر ایک دوسرا شرنی کمار کا کسی بات پر پریم بالا سے جھگڑا ہو گیا۔ اور میں نے غصے میں آکر اشونی کمار کا پتا کر دیا۔ اور اُس کی جگہ روپ کمار کو لے کر مزید بیس روز کی شوٹنگ کی سات لاکھ اس میں کھل گئے۔

غرضیکہ اگلے سات مہینوں میں میرا اپنا ایسا ہو گیا تیس کے تیس لاکھ پکچر میں گل ہو گئے۔ اور پکچر ابھی نامکمل تھی۔ اور ڈسٹری بیوٹروں سے ایک دھیلہ نہ وصول ہوا تھا۔ اور ٹمّی اب نیو یارک میں تھا۔

میں نے سیٹھ بھوڑی مل سے پیسے مانگے۔ وہ صاف مُکر گیا۔ بولا۔

میرے خیال میں گورو مہاراج آپ کو فلم کا کام راس نہیں آیا۔ میرے خیال میں تو اب آپ کو سیدھا ہمالیہ چلا جانا چاہیئے۔

میں نے دادا دھمال سے بات کی۔ تو وہ بولا۔ سیٹھ کیا بتاؤں، کس قدر شرمندہ ہوں۔ جانے کیسی گھڑی تھی وہ منحوس جب ہم نے یہ پکچر شروع کی تھی۔ دے کے میرے پاس ایک یہ چھکڑا گاڑی ہے۔ چاہو تو اسے لے لو۔ پانچ سات سو میں تو بک ہی جائے گی!

پانچ سات سو سے کیا ہوگا۔ میں نے پوچھا۔

ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ وہ بولا میں نے اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی اتنا عرصہ کسی دوسری جگہ کام کیا ہوتا تو اب تک دو پکچریں ختم کر ڈالتا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے سیٹھ اگر تم کہیں سے تین لاکھ کا بندوبست کر دو۔ تو میں تین لاکھ میں ہی پکچر ختم کر دوں گا۔ پکا وعدہ کرتا ہوں۔ تین لاکھ کے بعد سارا پیسہ ڈسٹری بیوٹر سے آجائیگا۔ اور اپنی جیب سے ایک دھیلہ نہیں جائیگا۔

مگر تین لاکھ روپے کون دے گا؟

دو تین دن میں اسی پریشانی میں گھومتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ آخر ایک شام میں نے فیصلہ کیا۔ مجھے پریم بالا کے ہاں جانا چاہیئے۔ اور اس سے تین لاکھ کا

قرض مانگنا چاہیئے۔ دیکھا جائے۔ تو میرے روپے اُس پر واجب بھی ہیں اپنے کنٹریکٹ کی رقم کے علاوہ وہ مجھ سے دو لاکھ قرض لے چکی ہے۔۔۔ دو لاکھ اگر وہ واپس کر دے اور ایک لاکھ مجھے قرض دے دے۔ تو پھر بیڑا پار ہو سکتا ہے!

یہی سوچ کر ایک دن شام کو ہمت کر کے اُس کے بنگلے میں چلا گیا۔ ڈرائنگ روم کے اندر جاتے ہی مجھے دھچکا سا لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اشونی کمار کی گود میں بیٹھی ڈرنک کر رہی ہے۔ وہی اشونی کمار جسے میں نے پریم بالا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر پکچر سے نکال دیا تھا۔ اور اس کا سارا حساب چکتا کر دیا تھا۔ اس وقت وہ اُسی اشونی کمار کی آغوش میں بیٹھی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا ترش رو ہو کر بولی۔

کیا ہے؟ کیا ہے؟ ایسے بن بلائے منہ اُٹھائے اندر کیوں چلے آئے؟

مَیں نے کہا۔ اس وقت ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اس پکچر میں میرے تیس لاکھ روپے ختم ہو چکے ہیں۔ اب اگر تم تین لاکھ دے دو۔ تو میری پکچر مکمل ہو سکتی ہے!

تین لاکھ میں دے دوں! وہ حیرت سے چلائی۔ میرے قریب آ کر بولی

تم پاگل تو نہیں ہو۔

بالکل تو نہیں تھا۔ مگر بنایا گیا ہوں۔ میں تم سے کچھ زیادہ نہیں مانگ رہا ہوں۔ دو لاکھ کا قرض تم پر واجب ہے۔

کیسا دو لاکھ کا قرض؟ وہ زور سے چیخی۔

ڈیڑھ لاکھ تو تم نے انکم ٹیکس ادا کرنے کے سلسلے میں لیا تھا۔ اور پچاس ہزار ایک نئی گاڑی خریدنے کے لیے لیا تھا۔ یاد آیا ڈارلنگ؟

ڈارلنگ؟ میں کسی کی ڈارلنگ نہیں ہوں! پریم بالا چیخ کر بولی۔ تم نے سُنا اشونی؟ یہ گدھا مجھے ڈارلنگ کہتا ہے!

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ کل تک جب تک میری جیب میں تیس لاکھ روپیہ تھا۔ میں سب کا ڈارلنگ تھا۔ آج میں ایک گدھا ہوں۔

گیٹ آؤٹ یُو ڈرٹی ڈنکی! وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے طمانچے مارنے لگی!

مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ بس پریم بالا —— میں بھی اب یہاں سے واپس نہیں جاؤں۔ اور جاؤں گا تو اُسی وقت جاؤں گا۔ جب تم میرا روپیہ لوٹا دو گی۔

تُو نہیں جائے گا؟ وہ بولی۔

نہیں!

نہیں ! !

نہیں !؟ میں نے مضبوطی سے جواب دیا۔

پریم بالا نے ایک چھڑی اُٹھالی۔ اور اشونی سے بولی۔ اشونی تم ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کردو۔ اور وہ دوسری چھڑی بھی اُٹھالو۔۔۔۔

پُونا جانے والی لمبی اکیلی اُداس سڑک پر ایک گدھا چلا جارہا تھا۔
اُس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک بیل مرا پڑا ہے اور اُس کے
سرہانے دو انسان ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں۔

کیا ہُوا؟ گدھے نے رُک کر پُوچھا۔
ہمارا بیل مر گیا۔ مرد نے غم سے سسکتے ہوئے کہا۔
تو دوسرا بیل خرید لو! گدھے نے مشورہ دیا۔

کوئی دوسرا بیل اس بیل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ہم نے اسے بڑی مشکل سے سدھایا تھا۔ ہم اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے تھے۔ اور کسانوں کا مجمع اکٹھا کر کے اس بیل سے اُن لوگوں کی قسمت کا حال بتاتے تھے! عورت نے سنتے ہوئے اپنی بپتا کہہ سنائی!

گدھے نے کہا۔ وہ زمانہ لد گیا جب اندھے بیل کسانوں کو اُن کی قسمت کا حال بتاتے تھے۔ اور غریب کسان ایک اندھے بیل کی طرح اپنی قسمت کے کولھو کے گرد گھومتے جاتے تھے۔ یہ زمانہ آنکھیں کھول کر کام کرنے کا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے لو۔ اور اپنے کسان دوستوں میں لے چلو۔ میں انھیں اخبار پڑھ کر سناؤں گا۔ اور زندگی کی نئی تقدیر بتاؤں گا۔ جو ہتے سے نہیں بلکہ سچی محبت سے پیدا ہوتی ہے!

دھرتی وشال تھی۔ آسمان بے کنار تھا۔ اور اب وہ تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک مرد ایک گدھا ایک عورت۔ مرد جو خالق تھا عورت جو ماں ہے گدھا جو زندگی کی محنت اور اُس کی مخصوصیت ہے!

. . . .